ماہنامہ

# اشراق

لاہور

نومبر ۲۰۱۰ / دسمبر ۲۰۱۰

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی





خصوصی شمارہ

## ڈاکٹر محمد فاروق خان کی شہادت

وہ قتل گاہوں میں شاخ زیتون لے کے پھرتا رہا ہمیشہ
اگرچہ برسوں سے اپنے قابیل کے ارادوں کو جانتا تھا

دارالاشراق

## شذرات



## بیاد ڈاکٹر محمد فاروق خان

خورشید احمد ندیم

# ڈاکٹر فاروق خان کی شہادت



اپنی سدا بہار مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر فاروق خان لحد میں اتر گئے۔ پسِ مرگ اس لازوال تبسم کے گرد آسودگی اور طمانیت کا ہالہ تھا۔ جیسے موجوں سے الجھتے الجھتے کسی کو کنارہ مل جائے۔ جیسے تاریک رات اور گھنے جنگلوں میں راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی کا قدم اچانک ایک کشادہ شاہراہ پر آپڑے۔ ایسے لمحوں میں جو اطمینان ایک راہ رو کو نصیب ہوتا ہے، وہی اطمینان ڈاکٹر فاروق خان کے چہرے کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھا۔

ایک مسلمان کی زندگی کیا ہے ـــــ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، جیسے پسِ دیوارِ زنداں ایک قیدی۔ وہ قید سے نکلتا ہے تو آسودہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اعلان کیا کہ وہ جب اس دنیا میں خیر کی علامت بن کے جیتا اور پھر رخصت ہوتا ہے تو اسے نفسِ مطمئنہ کے نام سے آواز دی جاتی ہے۔ پروردگار کی رضا اس کی منتظر ہوتی ہے اور اللہ کی جنت اس کا استقبال کرتی ہے جو اُس جیسے آسودہ حالوں کا دائمی مسکن ہے۔ میری بیس اکیس سالوں پر محیط یادوں کی گواہی یہ ہے کہ وہ وقت کی موجوں سے الجھتے اور دنیا کے جنگل میں گم راہ کرنے والی تاریکیوں سے دامن بچاتے سرخ رو ہو کر اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے ہیں۔ ان کے چہرے پر رقص کرتا اطمینان اظہار ہے کہ وہ حالتِ ایمان میں اور دینِ حق کے ایک سچے خادم اور داعی کی زندگی گزار کر لحد میں اترے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو نفسِ مطمئنہ کے منصب پر فائز ہوتے ہیں :

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تعلق اور رفاقت کے ان برسوں کو اگر میں ایک جملے میں سمیٹنے کی سعی کروں تو کہہ سکتا ہوں

کہ ان کے ساتھ صرف تعلقِ خاطر رکھا جا سکتا تھا۔ وہ سب سے محبت کا تعلق رکھتے تھے اور کسی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان سے محبت کا رشتہ قائم نہ کرے، اِلّا یہ کہ دل سخت اور انسانی احساسات کی تمیز سے بے نیاز ہو جائے۔ وہ اختلاف کو بھی ایسے اسلوب میں بیان کرتے کہ ان کے مؤقف کو قبول نہ کرنے والوں کے لیے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ ان کی حلاوتِ طبع کو رد کر سکے۔

ہمارے اس شہید بھائی کو اللہ تعالیٰ نے متنوع صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ علمی ذوق رکھتے تھے اور اس پر قادر تھے کہ اپنے مدعا کو مخاطب کے دل و دماغ میں اتار دیں۔ وہ دعوت کا مزاج رکھتے تھے اور ابلاغ کا سلیقہ بھی۔ دعوت میں موعظتِ حسنہ کیا ہوتی ہے اور احسن مجادلہ کیسے ہوتا ہے، کوئی جاننا چاہتا تو ان کی رفاقت میں کچھ وقت گزار کر جان سکتا تھا۔ وہ سیاست کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ تھے۔ انتخابات میں ''اسلامک فرنٹ'' کے امیدوار بنے تو بائیس ہزار ووٹ لیے جب بڑے بڑے راہنما دس ہزار سے زیادہ ووٹ نہ لے سکے۔ وہ صاحبِ قلم بھی تھے۔ مستقل تصانیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک اخبار کے لیے کالم بھی لکھا اور لوگ اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری دور میں وہ ایک ماہرِ تعلیم کے طور پر سامنے آئے۔ تنہا ایک یونیورسٹی کو تصور سے واقعہ بنا دیا۔ ان سب صفات کے پس منظر میں موجزن ان کا بے پناہ تحرک، ہم سوچتے اور حیران ہوتے تھے۔

ان متنوع صفات کی موجودگی میں، ان کے لیے ہمیشہ یہ طے کرنا مشکل رہا کہ وہ اپنے لیے کس میدانِ عمل کا انتخاب کریں۔ یوں انھوں نے ہر دشت کی سیاحی کی۔ بیس برس پہلے وہ اس اصول کے قائل ہو چکے تھے کہ اس محدود حیاتِ مستعار میں، کسی فردِ واحد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت ہر میدان میں مردِ میدان ثابت ہو۔ اسے بہر حال کسی ایک شعبے ہی کو اپنی سعی و کاوش کا مرکز بنانا ہے۔ اس نظری یک سوئی کے باوصف، انھیں یہ طے کرنے میں وقت لگا کہ سیاستِ دوراں، ان جیسوں کا میدان نہیں۔ زندگی کے آخری دور میں وہ اس پر یک سو ہو چکے تھے کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم و تربیت ہے۔ جب تک ہم اپنے سماج کو درست فکری اساسات فراہم نہیں کریں گے، یہ زندگی کی دوڑ میں سرخرو نہیں ہوگا۔ اِس کے لیے لازم ہے کہ عامۃ الناس کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ ایک طرف معاشرے میں رائج مذہبی و سماجی تصورات کی اصلاح ہو اور دوسری طرف رواجی اور رسمی تعلیم کو بھی صحیح بنیادیں فراہم کی جائیں تاکہ نئی نسل ان علوم، فنون اور تربیت سے پوری طرح بہرہ ور ہو جو ہمارے اجتماعی وجود کی ناگزیر ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صاحب گذشتہ کئی برسوں سے، ہمہ تن اسی میں مصروف تھے۔ ایک طرف اپنی تصانیف، خطبات اور روابط

کے ذریعے سے مذہب اور سماج سے متعلق اُن سوالات کو اپنا موضوع بنائے ہوئے تھے جن کا جواب فراہم کیے بغیر ایک جدید مسلمان معاشرے کے خدوخال واضح نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف سوات یونیورسٹی ان کی پہلی ترجیح بن چکی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا رومانس تھا۔ اس میں شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس چاہت پر انھوں نے اپنی زندگی بھی نچھاور کر دی۔

ڈاکٹر فاروق خان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی ایک مستقل تحقیق کا موضوع ہے کہ پختون معاشرت میں، وہ فکری اعتبار سے منفرد اور اجنبی تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ وہ عمومی روش کے برخلاف ایک مقدمہ قائم کیے ہوئے تھے۔ وہ دریا کے بہتے دھارے کی مخالف سمت میں تیر رہے تھے۔ اپنے رہن سہن اور طرزِ معاشرت میں، وہ روایتی پختون تھے،۔ تاہم اپنے اندازِ فکر میں سب سے مختلف تھے۔ اگر ہم معاصر پختون سماج کا نظریاتی مطالعہ کریں تو ہمیں دو رجحانات دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جس کی فکری تشکیل دو اصولوں پر ہوئی ہے۔ تصورِ قومیت اور سیکولرزم۔ اے این پی کو ہم اس کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جسے ہم روایتی مذہبی گروہ کہتے ہیں۔ اس وقت طالبان بھی اسی کے نمائندہ ہیں۔ اس رجحان کی بھی دو نظری بنیادیں ہیں۔ تصورِ جہاد کا فہمِ نو اور فقہ حنفی۔ ان کے علاوہ شاید ہم اس وقت کی پختون معاشرت میں کوئی تیسرا زاویۂ نظر تلاش نہ کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب ان دونوں سے مختلف تھے۔ اقبال کے الفاظ میں وہ ابلۂ مسجد تھے نہ تہذیب کے فرزند۔ یہ معلوم ہے کہ وہ روایتی مذہبی فکر کے ناقد تھے۔ بایں ہمہ، وہ سیکولرزم کے بھی خلاف تھے۔ استادِ محترم جاوید احمد صاحب غامدی سے ملاقات کے بعد، انھوں نے اس فہمِ دین کو اپنا لیا تھا، جس نے امام حمید الدین فراہی کے نہاں خانۂ دل میں جنم لیا، مولانا امین احسن اصلاحی نے جسے ایک دیدہ زیب عمارت میں بدل دیا اور تیسرے مرحلے میں جو اللہ کے فضل و کرم سے ایک دبستان بن چکا ہے۔ یہ خدانخواستہ دینی روایت میں کوئی نئی بات ہے نہ ہماری روایت سے متصادم ہے۔ یہ تجدید و احیائے دین کے مسلسل عمل کا اگلا مرحلہ ہے۔ یہ دراصل امتِ مسلمہ کو فکری طور پر اس صدرِ اوّل سے وابستہ کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے جب فکر و نظر پر قرآنِ مجید کی حاکمیت قائم تھی اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تشریح و وضاحت ہی فہمِ دین میں مستقل بالذات ماخذ تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس روایت سے وابستہ ہوئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ ان کے مضطرب دل و جان کو یہیں قرار آ گیا:

حزیں از پائے رہ پیمابسے سرگشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالین آسائش رسید ایں جا

پختون معاشرت میں یہ ایک منفرد آواز تھی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اجنبیت میں کمی آ رہی تھی۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور نئی نسل میں ان کے راز داں پیدا ہو چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب اس اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ انھوں نے اپنے سماج میں ایک تیسرے زاویۂ نظر کی بنیاد رکھ دی تھی۔

جو لوگ اس نظامِ فکر سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہاں آخرت کو مقصود و محور کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے سوا کوئی دنیاوی کامیابی ایسی نہیں جو مقصود بالذات ہو۔ یہاں کامیابی یہ ہے کہ آدمی اس احساس کو کبھی مرنے نہ دے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسے اپنے پروردگار کے حضور پیش ہونا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی اس سے غافل نہیں رہے اور یہی ان کی کامیابی ہے۔ اس حوالے سے ان کے ترجمۂ قرآن کا ذکر اہم ہے۔ ان کے پیش نظر ایک ایسا ترجمۂ قرآن تھا جس میں اردو کے رائج تراجم کی خوبیوں اس طرح جمع ہو جائیں کہ ایک عام پڑھا لکھا آدمی قرآن مجید کے ساتھ آسانی سے وابستہ ہو جائے۔ تاہم، ان کا اصل مقصد کچھ اور تھا اور یہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی طلب تھی۔ پانچ برس کی یہ محنت ۲۰۰۶ء کے رمضان المبارک میں تمام ہوئی تو اس کا اختتام انھوں نے ان الفاظ پر کیا:

> ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے اس حقیر اور عاجز بندے کو آسان ترین ترجمہ وتفسیرِ قرآن مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس کام پر اس عاجز کے پانچ برس لگے۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے۔ اس ترجمہ وتفسیر میں جو کچھ صحیح ہے، وہ اللہ کی رہنمائی کی بدولت ہے اور جہاں کہیں مجھ سے غلطی ہوئی ہے، وہ میرے اپنے علم وفہم کا قصور ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے یہ کام صرف اپنی مغفرت کے لیے کیا ہے۔ اس لیے اللہ کی بے پایاں رحمت سے یہ امید رکھتا ہوں کہ اگر اس کام میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ اسے معاف کر دے گا۔''

ڈاکٹر فاروق صاحب کی شخصیت کو ہم نے ایک اور پہلو سے بھی دیکھا۔ سچ یہ ہے کہ انسانوں کو پرکھنے کا اصل معیار یہی ہے۔ یہ ہے انسانی اقدار سے وابستگی۔ فکر ونظر کی دنیا میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ دین کے فہم میں، یہ ممکن ہے کہ ہمارے نتائجِ فکر میں صحت کا فقدان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور رسوخ فی العلم رکھنے والے کبھی اپنی بات کو واحد حق کے طور پر پیش نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنی رائے اور تفہیم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہر آدمی کے فہم میں صحت اور عدم صحت، دونوں کا امکان ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ تاہم انسانی اخلاقیات وہ معاملہ ہے جس کی بنیاد مسلّمات پر ہے۔ دوسروں کے جان و مال اور عزت وآبرو کی حرمت کے بارے میں دنیا کے مہذب معاشروں میں کبھی دو آرا نہیں رہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے مسالک میں بھی اخلاقیات کا شمار متفق علیہ امور میں ہوتا ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو سماج میں کسی فرد کے کردار کا تعین کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایسی شخصیت تھے کہ جب ہم

انھیں اس معیار پر پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بے مثال آدمی تھے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے معاملہ اور سفر کو رائے قائم کرنے کے لیے معیار بتایا ہے۔ میں نے ان کے ساتھ بارہا سفر کیا اور کئی طرح سے معاملہ بھی کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کھرے اور صاف ستھرے آدمی تھے۔ اعلیٰ اخلاقی معیارات ان کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوئے۔ ان سے نظری اختلاف رکھنے والے بھی جانتے تھے کہ ان سے کبھی ایسے جواب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جو مسلّمہ اخلاقیات کے خلاف ہو۔ داعیانِ مذہب کے لیے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے یہی سنت قائم کی ہے کہ اس وادی میں قدم رکھنے والا یہ جان لے کہ اگر اخلاق اور کردار کا اثاثہ اس کے پاس نہیں ہے تو وہ اس میدان کا انتخاب نہ کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دین کی دعوت اور معاشرے کی اصلاح کو اپنے لیے بطور میدانِ عمل انتخاب کیا تو انھوں نے اس کے تقاضے بھی نبھائے۔ وہ اگر کسی دینی یا مذہبی جماعت یا ادارے کی مالی معاونت کرتے تھے تو اس سلسلے کو اس کے باوجود جاری رکھا کہ اُن جماعتوں اور اداروں کی طرف سے ان کے بارے میں کبھی کلمۂ خیر نہیں کہا گیا۔ اپنے علم کی حد تک میں اپنے معاصر معاشرے میں اس طرح کی کوئی دوسری مثال تلاش نہیں کر پایا۔ یہ احسان کا درجہ ہے جس کی وہ لوگ تمنا کرتے ہیں جو اللہ کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا وجود سراپا خیر تھا۔ شاید ان طالب علموں کی تعداد سیکڑوں میں ہو، جن کی کفالت وہ بہت خاموشی کے ساتھ کر رہے تھے۔ کتنے مریض تھے، وہ جن کی نفسیاتی وجسمانی امراض ہی کے معالج نہیں تھے، افلاس جیسی بیماری کا بھی علاج تھے۔ نیکی کے کتنے کام تھے جو ان کی مدد سے جاری تھے۔ سیلاب، سوات کے آپریشن، کتنے مواقع ہیں جب وہ انفاق فی سبیل اللہ کی مجسم تصویر بن جاتے تھے۔ ہم شاید یہ اندازہ نہ کر سکیں کہ ان کے جانے سے، اس معاشرے سے کتنا بڑا خیر رخصت ہو گیا ہے۔ کون ہے جسے موت سے مفر ہے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول سے فرمایا: انك ميت و انهم ميتون۔ آپ کو دنیا سے رخصت ہونا ہے اور باقی آپ کے مخاطبین کو بھی نہیں رہنا۔ صدق اللّٰہ العظیم۔ سچ فرمایا اللہ بزرگ وبرتر نے۔ اگر عالم کا پروردگار اپنے رسول سے یہ کہہ رہا ہے تو ہما شما کس شمار میں۔ ان کا جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، لیکن کیا اس سماج کو خبر ہے کہ اس کا دامن کن نعمتوں سے خالی ہو گیا؟ یہ ایک فرد کی موت نہیں ہے، ایک علامت کا سماج سے اٹھ جانا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ، تحمل، بردباری، برداشت، محبت، زندگی، امن، خیر خواہی جیسی ان گنت صفات اس ایک وجود میں سمٹ آئی تھیں۔ یہ اس خواہش کی موت ہے کہ انسانوں کی جان لینا صرف اللہ کا حق ہے۔ اُس کے اذن کے بغیر لوگ نہ اپنی جان دیں نہ دوسروں کی جان لیں۔

خسارے میں وہ نہیں، ہم ہیں، یہ معاشرہ ہے جو ایک بڑے خیر سے محروم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو تو جانا ہی تھا اور

اس سے بڑی خوش بختی کیا ہے کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے رخصت ہوئے۔ کاش، ان کی موت کے آرزومندوں کو یہ سمجھایا جا سکتا کہ تمھیں جس بات سے اختلاف تھا، وہ تو زندہ ہے، ان کی کتابوں میں، خطبات میں اوران سے متاثر خلقِ خدا میں۔ اس بات کو موت صرف اس وقت آسکتی ہے جب کوئی اس سے بہتر بات لوگوں کے سامنے رکھے گا۔ بصورتِ دیگر ڈاکٹر فاروق خان کی موت ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہوں

---



اللہ سراسر سلامتی ہے۔ اس کی ذات ہر عیب اور خامی سے پاک ہے۔ وہی غالب ہے۔ وہ عادل ہے۔ وہ ہر چیز کا علم اور اس کی خبر رکھتا ہے۔ وہی نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا اور صورت گری کرنے والا ہے۔ وہ سب سے الگ ہے لیکن سب کا سہارا ہے۔ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ تمام اعلیٰ اور اچھی صفات مثلاً رحم، قدرت، مہربانی، خیر، سمع، علم سب اپنی انتہائی اور آخری صورت میں صرف اس کے لیے خاص ہیں۔ اس کی کوئی صفت کسی دوسری صفت کو کم نہیں کرتی اس کی صفت رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اس کے سب فیصلوں کی بنیاد ہے۔

وہی اللہ ہے جو ہمارے دل کے رازوں تک سے واقف ہے۔ جس کے علم میں ہر چیز ہے۔ یہاں تک کہ کوئی پتا تک نہیں ہلتا، مگر یہ کہ اس کے علم میں ہوتا ہے۔ وہی ہے جو ہمارے دکھوں سے واقف ہے۔ جس سے ہم تنہائیوں میں ہم کلام ہو سکتے ہیں، جس کے سامنے ہم اپنی فریادیں رکھ سکتے ہیں جس سے ہم دعا مانگ سکتے ہیں۔ ایک وہی ذات ہے جس پر اعتماد انسان کو خودداری اور عزت نفس کی دولت دیتا ہے۔ اس ذات کا سہارا انسان کے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے۔ اللہ پر توکل انسان کو عزم و حوصلہ دیتا ہے۔ اس کی ذات پر یقین انسان کو سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا ہے۔

(ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب'' سے ایک اقتباس ۸)

جاوید احمد غامدی

# مٹی کا دیا

(برادرم محمد فاروق خان کی شہادت پر لکھے گئے)

ہمارے درماندہ کارواں میں وہ اک متاع گراں بہا تھا
ہزار رستوں کے پیچ و خم ہوں، وہ پھر بھی امید کا درا تھا
وفا کا پیکر، جنوں کی ہر راہ کا مسافر، وہ مرد میداں
وغا ہو یا آشتی، محبت کے ہر قرینے سے آشنا تھا
جمال بھی تھا، کمال بھی تھا، مگر وہی بات تھی کہ گویا
درخت کو خود اُسی کے پھل نے زمیں کی جانب جھکا دیا تھا
وہ قتل گاہوں میں شاخ زیتون لے کے پھرتا رہا ہمیشہ
اگرچہ برسوں سے اپنے قابیل کے ارادوں کو جانتا تھا
یتیم بچوں کا باپ بن کر سروں پہ رکھتا تھا ہاتھ اُن کے
وہ اپنے آقا کی پیروی میں کئی غریبوں کا آسرا تھا
اُسی سے لڑنے نکل پڑا تھا تمام تاریک آندھیوں سے
اگرچہ مٹی کا اُس کے ہاتھوں میں ٹمٹماتا ہوا دیا تھا
اسی تمنا میں جی رہے تھے، ہوئی سعادت نصیب اُس کے
سبب یہی ہے کہ اِس تمنا میں ہم سے آگے بڑھا ہوا تھا

مکالمہ: عمران یوسف
ترتیب: منظور الحسن

# ڈاکٹر فاروق خان کی شہادت پر غامدی صاحب کی گفتگو



[یہ جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو ہے جو انھوں نے ڈاکٹر محمد فاروق خان کی شہادت کے موقع پر www.al-mawrid.tv کے نمائندے جناب عمران یوسف کو انٹرویو دیتے ہوئے کی۔ گفتگو کے تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہوئے سوالات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مرتب]

ڈاکٹر محمد فاروق خان میرے عزیز بھائی تھے، میرے دوست تھے، ہمدم دیرینہ تھے۔ لوگ ان کے علم و فضل کا ذکر کریں گے، ان کی تصنیفات کا ذکر کریں گے، ان کی خطابت کا ذکر کریں گے، ان کی دینی خدمات کا ذکر کریں گے، انھوں نے اپنے صوبے میں تعلیم کے لیے جو خدمات انجام دیں، ان کا ذکر کریں گے ـــــ اس میں شبہ نہیں کہ ان سب باتوں میں وہ ہمارے ممدوح تھے ـــــ لیکن جس چیز نے مجھے ان کی محبت میں ہمیشہ گرفتار کیے رکھا، وہ ان کی انسانیت تھی۔ وہ کمال انسانیت کا بہترین نمونہ تھے۔ ان کو جس شخص نے بھی قریب سے دیکھا، وہ یہ جانتا ہے کہ ان کا حلم، ان کی متانت، ان کی انسان دوستی، ان کے چہرے پر ہر لحظہ کھلتا ہوا تبسم، یہ سب ان کی شخصیت کا ناگزیر حصہ بن چکا تھا۔ میری ان کے ساتھ کم و بیش بیس سال کی رفاقت تھی۔ اس عرصے کے دوران میں مجھے ایک دفعہ بھی یاد نہیں ہے کہ کبھی ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو یا ان کے رویے میں کوئی چیز انسانیت کے اعلیٰ مدارج کے خلاف محسوس کی ہو۔ وہ ہمیشہ اپنے معیارات کو قائم رکھتے تھے۔ گفتگو میں، معاملات میں، اخلاقیات میں وہ بڑی بلند پایہ شخصیت تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اصلی حسن یہی تھا۔ وہ ہمیشہ امن کے پیغام بر رہے اور عمر بھر امن و سلامتی ہی کا درس دیتے

رہے۔

ہمارا فکر جیسا کچھ بھی ہے، اس کو اپنے علاقے میں عام کرنے میں ان کا غیر معمولی کردار رہا۔ انھوں نے اس کی شرح میں کتابیں لکھیں، انھوں نے اس کی وضاحت کے لیے تقریریں کیں، وہ سیمیناروں میں گئے، وہ مجالس میں گئے اور پورے زور کے ساتھ، پورے اخلاص کے ساتھ اور پوری عزیمت کے ساتھ اس کی دعوت کو عام کرتے رہے۔ وہ دعوت حق کے شہید ہیں۔ انھوں نے اسی راہ میں اپنی جان قربان کی ہے۔ اس موقع پر جبکہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ میرے جیسے شخص کے جذبات کیا ہو سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے ایک بھائی سے محروم ہو گیا ہے، اپنے ایک ساتھی سے محروم ہو گیا ہے، اپنے ایک دوست سے محروم ہو گیا ہے..... شہادت کا جو عظیم مرتبہ انھیں ملا ہے، میں جب اس کا تصور کرتا ہوں تو بس یہی کہتا ہوں کہ:

حسرت آتی ہے کہ افسوس یہ میں کیوں نہ ہوا

قدرت جب اپنی محبوب شخصیات کو تخلیق کرتی ہے تو بعض غیر معمولی چیزیں ان کے اندر ودیعت کر دیتی ہے۔ حلم، متانت، شایستگی، تہذیب، نرم خوئی، یہی ان کا کمال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بنایا ہی ایسا تھا۔ یہ چیز ان کے خمیر میں ڈال دی گئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں جب ان کی تصویر آتی ہے، ان کے تبسم کے ساتھ آتی ہے۔ ان کو کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ وہ ''المورد'' کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن رہے۔ اس کے اجلاسوں میں ظاہر ہے کہ اختلافات بھی ہو جاتے تھے اور دوسروں سے شکایت کا موقع بھی پیدا ہو جاتا تھا، لیکن وہ ہمیشہ صلح جو رہتے تھے۔ ان کے قلم سے، ان کی زبان سے کبھی کسی کو دشنام سننے کا موقع نہیں ملا۔ دوسروں کے ساتھ تعلق خاطر میں ان کے ہاں نشیب و فراز نہیں آتے تھے۔ تعلقات کی جو سطح ایک مرتبہ طے ہو گئی، وہ اس میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے تھے، ہمیشہ اس کی پاس داری کرتے تھے۔ ان کی نگاہ مخاطب کے اخلاص پر ہوتی تھی اور اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ اپنے ہوں یا غیر، وہ ہمیشہ بڑی تہذیب اور شایستگی کے ساتھ بات کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں یہ نرمی فطری طور پر تھی، پھر جس فکر کے وہ علم بردار بن کر کھڑے ہوئے، وہ مبنی ہی اس چیز پر ہے کہ نہ ماننے والوں کے ساتھ ہمارا رشتہ دعوت کا ہے؛ ہمارا ہتھیار صرف استدلال ہے؛ ہمیں اپنی بات دلیل کے ساتھ بیان کرنی ہے۔ جب آپ اس مقام پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ کے اندر سختی در آئے، آپ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کریں یا آپ کسی کے اخلاص پر حملہ کریں۔ آپ اپنی دلیل پیش کریں گے اور خود بھی اس مقام پر کھڑے ہوں گے کہ ہو سکتا ہے کہ ہماری

بات میں غلطی ہو اور دوسرا اگر اس کو واضح کر دے گا تو ہم اس کو قبول کر لیں گے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب کے طرز عمل کو دیکھ کر اکثر یہ محسوس ہوا کہ گویا وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو سامنے رکھ کر عمل کر رہے ہیں۔ خدا نے اپنے آخری پیغمبر کی فطرت یہی بنائی تھی، آپ نخل فطرت کے بہترین ثمر تھے۔ آپ کی کریم النفسی پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آپ کے لیے رؤفٌ رحیمٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور فرمایا ہے کہ وَلَو كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ القَلبِ لَانفَضُّوا حَولِكَ، یعنی اے پیغمبر اگر آپ درشت خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب لوگ تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

ڈاکٹر فاروق خان آج سے بیس سال پہلے میرے پاس تشریف لائے تھے۔ ان کی اہلیہ ''اشراق'' کی قاری تھیں۔ انھوں نے میرے نام ایک خط لکھا اور کہا کہ میرے شوہر نے ''پاکستان کا مستقبل'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ ان کے سامنے مذہبی لحاظ سے کچھ الجھنیں ہیں، جن پر گفتگو کے لیے وہ آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھی کا خط لے کر وہ میرے پاس تشریف لائے اور کئی دن تک قیام پذیر رہے۔ اس دوران میں میرے اور ان کے درمیان بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ اس میں اختلاف بھی ہوا اور اتفاق بھی۔ بحث و نظر اور اتفاق و اختلاف کا یہ سلسلہ ان کی شہادت تک جاری رہا۔ فی الجملہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے بڑی حد تک میرے فکر کو سمجھ لیا تھا اور وہ اسی کے علم بردار تھے۔ بعض تعبیرات میں اختلاف ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ خود ایک صاحب فکر آدمی تھے۔ جس طرح مجھے بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف ہو جاتا ہے، انھیں بھی مجھ سے بعض چیزوں میں اختلاف رہتا تھا۔ پھر بہت سی چیزیں انھوں نے اس زمانے میں لکھیں، جب ابھی میں نے اپنی کتاب ''میزان'' کو مکمل نہیں کیا تھا۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ بعض معاملات میں لوگوں کو میرے اور ان کے زاویۂ نظر میں فرق نظر آئے۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ اِسی فکر کو لے کر اٹھے، اِسی کے لیے لوگوں کے سامنے شہادت دیتے رہے اور اِسی کے لیے انھوں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں پیش کر دی۔ ان کے جانے سے میں سمجھتا ہوں کہ میری قوم ایک بڑے آدمی سے محروم ہو گئی ہے۔ یہ کسی قوم کی بڑی محرومی ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کی شخصیات کو کھو بیٹھے۔ عربی زبان کا ایک مصرع ہے کہ:

أَضَاعُونِي وَأَيَّ فَتًى أَضَاعُوا!

''انھوں نے مجھے کھو دیا، دیکھو کیسے نوجوان کو کھو دیا!''

حقیقت یہ ہے کہ بڑا نقصان ہوا ہے، لیکن اس قوم کو شاید اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ابھی اپنے بلوغ کے اس مقام تک نہیں پہنچی کہ اپنی اصل خیر خواہ شخصیتوں کو پہچان سکے۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان کی جدوجہد اصل میں انفرادی جدوجہد تھی۔ یہ میری جو کچھ تھوڑی بہت کاوش ہے یا مجھ سے پہلے بعض بزرگوں کی کاوشیں ہیں، یہ بھی انفرادی ہیں۔ اس جدوجہد کو جب تک ایک مومنٹ، ایک تحریک کی صورت نہیں دی جاتی، اس وقت تک اسلام کو اور مسلمانوں کو دنیا کے سامنے دعوت کے صحیح مقام پر کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس وقت اس امر کی ضرورت ہے کہ عالم اسلام میں تجدید و احیا کی ایک بڑی تحریک برپا کی جائے۔ Reformation of Muslim religious thought کی تحریک۔ مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی تحریک۔ مسلمانوں کے مذہبی فکر میں ایسا تعفن پیدا ہو چکا ہے اور اس کے اندر ایسا جمود در آیا ہے کہ جب تک اس کو ختم نہیں کر دیا جائے گا اور جب تک اس کو توڑ نہیں دیا جائے گا اور جب تک مسلمانوں کے مذہبی فکر کو قرن اول کی تعبیر اسلام کی روشنی میں جانچ کر، پرکھ کر دوبارہ ایک نئی صورت میں تشکیل نہیں دیا جائے گا، اس وقت تک ہم درپیش صورت حال کا مقابلہ کر نہیں سکتے۔

ڈاکٹر صاحب کا جانا بلاشبہ، ایک بڑا نقصان ہے، لیکن یہ خدا کے کام ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ: کوئی شخص بھی ناگزیر نہیں ہے۔ اللہ کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ پتھروں کے نیچے سے ابراہیم پیدا کر دے۔ دین اُس کا ہے، دعوت اُس کی ہے، پیغام اُس کا ہے۔ ہم تو بس خدام ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ناگزیر نہیں ہے۔ ہم چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کے دوسرے خدام پیدا کر دے گا۔ ہمیں جو موقع ملا ہے، اس میں ہمارا کام فقط یہ ہے کہ دین کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ اللہ کا دین ہم پر نہیں کھڑا، اس کا دین اس کی اپنی حکمت پر قائم ہے اور وہ اس کے اسباب پیدا کرتا رہتا ہے۔ ہم دین کے خادم ہیں، دین کے محسن نہیں ہیں۔ ڈاکٹر فاروق خان بھی دین کے خدام میں سے ایک خادم تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان کی خدمت کو قبول فرمائے۔

جہاں تک ان کی شہادت کی ذمہ داری قبول کرنے والوں کا تعلق ہے تو ان کی خدمت میں میں صرف یہی عرض کروں گا کہ وہ اپنے آپ کو داروغہ نہ سمجھیں، اپنے آپ کو داعی بنائیں۔ دوسروں کی بات بھی تحمل کے ساتھ سنیں۔

استدلال کے ہتھیار کے ساتھ سامنے آئیں۔ یہ ظلم جو انھوں نے کیا ہے اور اس طرح کے مظالم جو اس سے پہلے وہ کرتے رہے ہیں، انھیں دیکھ کر مجھے اندیشہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں کہیں ان سے بھی وہی سوال نہ کیا جائے:

وَاِذَا الْمَوْءُ دَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ؟ (التکویر ۸۱: ۸-۹)

''اور جب اُس سے جو زندہ گاڑ دی گئی، پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟''

---



جب کوئی آزاد قوم اپنے اخلاق و کردار اور دنیوی طاقت کے اعتبار سے ایک اچھے مقام تک پہنچ جاتی ہے تو پروردگار ایسی قوم پر غلط کار حکمران مسلط نہیں رہنے دیتا۔ بلکہ پھر ایسے ملک کو اچھے حکمران مل جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی غلام قوم متحد ہو جائے، بنیادی انسانی اخلاقیات پر کاربند ہو جائے، اور عدم تشدد پر مبنی پرامن جدوجہد کرے تو پروردگار ایسی قوم کے لیے آزادی کا راستہ کھول دیتا ہے کیونکہ پروردگار عادل ہے اور انصاف کرتا ہے۔

اتحاد، پرامن جدوجہد اور صبر کی طاقت سے بڑھ کر اور کوئی طاقت نہیں۔ ممکن ہے کہ کامیابی حاصل کرنے میں کئی سال لگیں یا کئی نسلیں جدوجہد کریں۔ لیکن جب ایک قوم ان تینوں باتوں پر عمل پیرا ہو تو کسی نہ کسی وقت اللہ کی طرف سے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہی صحیح راستہ ہے۔ اس کے برعکس بے صبری اور جلد بازی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔

(ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''جہاد و قتال ـــــ چند اہم مباحث'' سے ایک اقتباس ۴۸)

ڈاکٹر محمد خالد مسعود*

# ڈاکٹر محمد فاروق کی شہادت ـــــ ایک لمحۂ فکریہ



جو شخص پہلی ہی ملاقات میں دل میں گھر کر جائے اور جو محبت بانٹتا ہو، وہ نفرت کا نشانہ کیسے بن گیا؟ کیا نفرتوں کی شدت سے ہمارے دل اتنے پتھر ہو چکے ہیں کہ ہم دوست اور دشمن میں تمیز کھو بیٹھے ہیں؟ کیا ہم اپنی سنگ دلی میں اتنے دور جا چکے ہیں کہ انسان دوستی، دردمندی، خیر خواہی، وسعت نظری، نرم کلامی اور سلاست فکری کو واجب القتل قرار دینے لگے ہیں؟ ہم کیسے خوف کا شکار ہیں کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی بات سننے سے ڈرتے ہیں۔ ہم اپنی آواز کو اس قدر پوجتے ہیں کہ دوسری آوازوں کو خاموش کرنا فرض سمجھنے لگے ہیں۔ ہم اتنے خود پسند اور اتنے خود پرست کیوں ہیں کہ یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کہ کوئی اور بھی ہماری بھلائی کی بات کر سکتا ہے؟ ہمارے ذہنوں میں یہ شدت اور سختی کہاں سے آ گئی ہے کہ ہم حکمت و موعظت کا جواب گولی سے دینے لگے ہیں؟ یہ تکبر اور غرور کیسا ہے جو نصیحت سے سیخ پا ہو کر قتل و غارت پر اتر آتا ہے؟ ڈاکٹر محمد فاروق کی شہادت کی خبر سنتے ہی اس طرح کے سوالوں نے اس طرح گھیرا ہوا ہے کہ ان کی شہادت میرے لیے ایک لمحۂ فکریہ بن گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے ایک اجلاس میں اسلام آباد میں ملاقات ہوئی۔ اسلام میں خواتین کے حقوق زیر بحث تھے۔ مقررین کی گفتگو زیادہ تر منفی رخ پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت متوازن اور مدلل گفتگو کرتے ہوئے خواتین کے حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالی۔ ان کے تحمل، دھیمے لہجے، لیکن دوٹوک اور واضح موقف نے بحث کا رخ موڑ دیا۔ ان کی گفتگو طوالتِ کلام، زورِ بیان اور لفظی گھن گرج کی بجائے استدلال کی قوت، مطالعے کی کثرت اور نقد و تجزیہ کی صلاحیت پر مبنی تھی۔ چنانچہ اجلاس میں نہ صرف موضوع بحث کے حوالے سے اسلام کے بارے میں

* سابق چیئر مین، اسلامی نظریاتی کونسل۔

ایک مثبت رجحان پیدا ہوا، بلکہ خواتین کے حقوق کے بارے میں ایک معتدل نقطۂ نظر سامنے آیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اکثر ملنا ہوتا اور ہر ملاقات میں ان کی صاف گوئی اور سلاستِ کلام کا قائل ہونا پڑتا۔ وہ اسلامی تعلیمات اور نصوص کو محض نقل نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے بیان کا حق ادا کرتے تھے۔ ان احکام کا سیاق وسباق واضح کرنے کے لیے وہ کسی ایک دلیل پر اکتفا نہ کرتے، بلکہ اس موضوع پر مختلف شواہد کو اس طرح پیش کرتے کہ نہ صرف حکم واضح ہو جاتا، بلکہ اس کا مقصد اور سبب بھی سامنے آ جاتا۔ وہ قدیم اور جدید میں اس خوبی کے ساتھ ربط پیدا کرتے کہ درمیان میں خلا تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے کم وبیش ان تمام موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر ہمارے ہاں عموماً اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اسلام میں خواتین کا مقام ومرتبہ ہو یا دور جدید میں ان کے حقوق اور آزادی کا، جرم وسزا کے پیچیدہ نظریات ہوں یا ان کی اصلاح کی ضرورت کا سوال، جہاد اور قتال کے بارے میں قدیم اور جدید موقف میں ٹکراؤ ہو یا مغرب سے مکالمہ، اسلامی معاشروں میں غیر مسلموں کے حقوق کی بات ہو یا نوجوان نسل کے اسلام کے بارے میں شبہات اور سوالات، ان سب موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ لکھا۔ میرے خیال میں ان کی سوچ میں نقاوت، ان کی گفتگو میں فصاحت اور ان کے قلم میں نظافت، ان کی طب وجراحت میں تعلیم اور نفسیات کے علم اور تجربے سے آئی تھی۔ آج سوچتا ہوں کہ ان کے جانے سے ہم نے بیک وقت کتنے علوم، تجربوں اور مہارتوں کو کھو دیا۔ ہم نے اس نظافت وطہارت اور فکری پاکیزگی کو قتل کر دیا جس کی آج ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ڈاکٹر فاروق نے تو شہادت پائی۔ وہ تو نفس مطمئنہ تھے جو پورے یقین وایمان سے اسلام کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے اہل خانہ کو بھی ان کی شہادت پر فخر ہو گا، لیکن ان کے دیگر پس ماندگان کو اس خلا کا شدت سے احساس ہے جو ان کی جوان موت سے پیدا ہوا ہے۔

میں اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر سکا کہ ڈاکٹر فاروق جیسے انسان دوست اور محبتیں بانٹنے والے شخص اتنی بے رحمی سے کیسے قتل ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے محسنوں اور خیر خواہوں کا خون کب تک بہاتے رہیں گے۔ آخر نفرتوں کی یہ آگ کب ٹھنڈی ہو گی؟

ڈاکٹر ممتاز احمد*

# ڈاکٹر فاروق خان شہید



ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن سے آپ زندگی میں شاید دو تین بار ہی ملے ہوں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ انھیں ایک مدّت سے جانتے ہیں۔ نہ صرف جانتے ہیں، بلکہ اُن سے محبت کا ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے جو زندگی بھر ـــ اور اُن کی موت کے بعد بھی ـــ قائم رہتا ہے۔ ڈاکٹر فاروق شہید ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ میں اُن کے نام سے تو واقف پہلے سے تھا، لیکن اُن سے پہلی ملاقات کئی سال ہوئے اُن کے دولت کدہ پر مردان میں ہوئی۔ میں پشاور میں تھا اور میں نے برادرِ عزیز سلیم صافی کی وساطت سے اُن سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ سلیم صافی کے ساتھ شام کو مردان حاضر ہو جاؤں گا۔ ڈاکٹر فاروق صاحب نے فرمایا: آپ کو آنے میں دقّت ہوگی، میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ہم لوگ پشاور سے چلے اور مغرب کے بعد پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خوبصورت اور خوش ذوقی سے آراستہ لان میں بیٹھنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ نہایت محبت کے ساتھ گلے لگا کر استقبال کیا اور ایسا لگا کہ وہ کسی اجنبی سے نہیں، بلکہ مدّت سے بچھڑے ہوئے کسی دوست سے معانقہ کر رہے ہوں۔

روشن چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں سوچ کی گہرائی اور ایک ایسی چمک جیسے کسی نئی دنیا کا سراغ پا لیا ہو۔ ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ، سفید شلوار قمیص میں ملبوس ڈاکٹر صاحب پہلی ہی ملاقات میں، بلکہ پہلی ہی نظر میں بھا گئے۔ ابتدائی تعارفی کلمات اور مشروبات کے بعد ہم سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے جہاں انھوں نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد ہم دوبارہ لان میں آ گئے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاید ہی کوئی موضوع

* ڈائریکٹر، اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ایسا ہو جس پر ہم نے گفتگو نہ کی ہو ــــ امریکا، پاکستان، دین، سیاست، جماعت اسلامی، جاوید احمد غامدی صاحب، صوبہ سرحد کی سیاست، دینی فکر کے نئے رجحانات۔

اس روز کی ملاقات اور گفتگو کے بعد میرے ذہن پر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فکر کا جو نقش بنا ــــ اور وہ نقش ابھی تک باقی ہے ــــ اُس کے کچھ پہلو ایسے تھے جو ان کے علاوہ کم ہی دوسروں میں نظر آئے۔

ایک تو خود ان کی شخصیت تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ اگر اس ملاقات میں وہ ایک لفظ بھی نہ بولتے اور صرف سامنے بیٹھے رہتے تب بھی میرے سفر کا یہ انعام کافی تھا۔ وقار کے ساتھ انکسار اور حلم کا ایسا امتزاج میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔

دوسری بات جس نے مجھے بے حد متاثر کیا، وہ یہ تھی کہ ساری ملاقات کے دوران میں مجھ سمیت حاضرینِ مجلس کے ساتھ اُن کا برتاؤ برابر کے احترام کا تھا اور اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اپنے آپ کو اُن کا شاگرد کہتے تھے۔ پشتون معاشرے میں ویسے بھی معاشرتی اونچ نیچ کا تصوّر اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جب تعلق کی نوعیت میزبان اور مہمان کی ہوتی ہے، لیکن ڈاکٹر فاروق خان شہید کی شخصیت کا یہ پہلو مجھے اپنے تجربے کی حد تک بہت نمایاں اور بھلا لگا۔

تیسری چیز جس کا تاثر ابھی تک قائم ہے، وہ ان کی گفتگو کا انداز تھا ــــ اور یہ بات بعد میں اُن کی تحریروں اور پبلک تقریروں میں بھی بہت نمایاں نظر آئی۔ اُن کی گفتگو سمجھنے اور سمجھانے کے انداز میں اور اپنے سارے جذبات کے باوجود ایسے دھیمے لہجے میں ہوتی تھی جس میں مخاطب کے احترام کا پورا پورا لحاظ ہوتا تھا۔ نہ کوئی ادعا تھا، نہ اپنے علم اور مطالعہ کا غرور۔ اپنے خیالات کے اظہار میں الفاظ کا محتاط انتخاب اور پھر اعتدال اور توازن کے ساتھ اپنی رائے کا بیان۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنی ساری گفتگو میں کسی ایک شخص کے بارے میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہو یا جس سے کسی کی مذمّت اور تذلیل ہوتی ہو۔ اپنے مخالفین یا اپنے نظریات کے مخالفین کے لیے بھی اُن کے دل میں خیر خواہی اور اصلاح کا جذبہ تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو لوگ اسلام کا نام لے کر شدت پسندی کے راستے پر چل نکلے ہیں، اُن کو دلیل کے ساتھ اور دین اور ملّت کی خیر خواہی کا واسطہ دے کر راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے اور اس مقصد کے لیے بعد میں وہ ایسے سرگرم ہوئے کہ مخالفین اُن کی کوششوں کی کامیابی کے امکانات سے خوف زدہ ہو کر، اُن کی جان لینے پر آمادہ ہو گئے۔

اسی ملاقات میں، میں نے ڈاکٹر صاحب شہید سے جماعتِ اسلامی سے اُن کی وابستگی اور پھر علیحدگی کے بارے

میں بھی کچھ سوالات کیے۔ انھوں نے جماعتِ اسلامی کے ساتھ اپنے تعلق کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس روداد میں جماعت کے کئی اکابرین کا تذکرہ بھی آیا اور جماعت کی بعض پالیسیوں سے اختلافات کی نوعیت بھی انھوں نے بیان کی، لیکن اس ساری گفتگو میں ایک بار بھی انھوں نے جماعت کے اپنے سابق ساتھیوں کے بارے میں کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جس سے اُن کی اہانت یا بے ادبی ہوتی ہو۔

ڈاکٹر فاروق شہید سے دوسری ملاقات کا موقع اس وقت ملا جب ۲۰۰۷ء میں، میں نے اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ''اسلام اور جدیدیت'' پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، بھارت اور جنوبی افریقہ کے دانش وراور پروفیسر حضرات بھی مدعّو تھے۔ مجھ سے زیادہ میرے بیٹے جنید احمد کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر فاروق صاحب کو بھی ایک سیشن میں مقرر کے طور پر مدعو کیا جائے۔ میں کانفرنس کی تیاریوں کے دوران میں امریکہ میں تھا، چنانچہ جنید نے خود ہی پہلے ای میل اور پھر فون پر میری جانب سے اُن سے رابطہ قائم کیا اور انھیں کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادہ کر لیا۔ میں نے پاکستان پہنچ کر انھیں فون کیا اور کانفرنس میں شرکت پر آمادگی کے لیے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے کہ عزیزی جنید نے جس محبت سے دعوت دی تھی میں بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اُن کی شہادت کے بعد جنید نے مجھے بتایا کہ اِس کانفرنس کے بعد بھی وہ مسلسل فون اور ای میل کے ذریعے سے اُن سے رابطے میں رہا اور وہ دعاؤں اور شفقت کے ساتھ بلا تاخیر اس کی ای میل کا جواب بھی دیتے رہے اور فون پر اس کی انٹ شنٹ باتیں سن کر اُس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ اس سال کے آغاز میں، جب وہ ایک اور کانفرنس کے سلسلے میں میری دعوت پر تشریف لائے تو میں نے اُن سے کہا کہ جنید کی جینز میں میری بہت سی خامیوں کے ساتھ ایک اچھی بات بھی منتقل ہوئی ہے اور وہ ہے آپ کی محبت۔ میری یہ بات سن کر بہت محظوظ ہوئے اور جنید کے لیے بہت دُعائیں کیں۔

اس کانفرنس کے جس سیشن میں اُن کی تقریر تھی، اُس میں کچھ Panelists ایسے بھی تھے جن کے اسلام کے بارے میں خیالات عام معنوں میں ''اجماع'' سے کچھ ہٹ کر تھے۔ ڈاکٹر فاروق صاحب نے نہایت مدلل اور Articulate انداز میں اسلام اور جدیدیت کے تعلق یا تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل پر اپنی بات پیش کی۔ لیڈز یونیورسٹی کے پروفیسر سلمان سیّد نے سیشن کے بعد اپنے مخصوص Understatement کے انداز میں مجھ سے کہا کہ یہ آپ کے ڈاکٹر فاروق صاحب گہری سوچ والے آدمی لگتے ہیں۔ اس سارے سیشن میں مجھے صرف اُن کی باتوں میں ایک نئی اور آزاد سوچ نظر آئی۔

غالباً اُسی سال امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر فرید اسحاق جن کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے، میری دعوت پر توسیعی لیکچرز کے سلسلے میں تشریف لائے۔ فرید افریقی ملکوں میں تیزی سے پھیلتی ہوئی موذی بیماری AIDS کی روک تھام اور AIDS کے مسلمان مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کے ایک ادارے Positive Muslims کے لیے خاصے سرگرم تھے۔ پاکستان آئے تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ علماء اور اسلامی علوم کے ماہرین سے مل کر مسلمان معاشروں میں AIDS کی روک تھام اور AIDS کے مریضوں کے لیے ایک ہمدردانہ رویّے کا شعور پیدا کرنے کے لیے ملاقاتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں کئی مشہور اور صاحبِ علم علما سے اُن کا رابطہ کرایا۔ جنید نے فون کر کے ڈاکٹر فاروق صاحب سے فرید کا تعارف کرایا اور اُن سے ملاقات کی درخواست کی۔ میں نے جنید سے کہا کہ تم نے مجھ سے کہا ہوتا، میں خود فون کر کے اُن سے درخواست کرتا۔ جنید نے کہا: ابو آپ کی ضرورت ہی نہیں پڑی، انھوں نے ڈاکٹر فرید اسحاق سے نہ صرف ملاقات کا وقت دے دیا ہے، بلکہ انھیں اپنے گھر مردان آنے کی دعوت بھی دے دی ہے اور فرید رات بھی اُنھی کے ہاں قیام کریں گے۔ یہ تھے ہمارے ڈاکٹر فاروق خان۔ ایک طالب علم کے فون پر اور نہایت مختصر نوٹس پر، اُنھوں نے نہ صرف ملاقات کے لیے وقت نکالا، بلکہ تھوڑی دیر بعد فون کر کے بھی کہا کہ ڈاکٹر فرید اسحاق اسلام آباد سے مردان آئیں گے اور اُسی روز شام کو واپسی ہو گی تو تھک جائیں گے، لہٰذا میں نے اُن کے رات کے قیام کا بھی انتظام کر لیا ہے۔

فرید اسحاق، ڈاکٹر فاروق سے پہلے اسلام آباد، لاہور اور کراچی کے کئی علما سے مل چکے تھے۔ جب مردان سے واپس آئے تو ڈاکٹر فاروق صاحب کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ نہ صرف اُن کی مہمان نوازی اور حسنِ اخلاق کے گرویدہ، بلکہ اُن کے علم اور اُن کی ذہانت کے بھی۔ فرید اسحاق نے کہا کہ ڈاکٹر فاروق صاحب اور دیگر علما کے درمیان جو واضح فرق اُنھیں نظر آیا، وہ یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب فقہی مخمصوں میں پڑنے کے بجائے براہِ راست قرآنِ پاک سے رہنمائی لیتے تھے اور بڑی بصیرت کے ساتھ قرآنی تعلیمات کا تعلق آج کے مسائل سے جوڑتے تھے۔ فرید اسحاق خود قرآن کے اسکالر ہیں اور قرآنِ پاک کی تعلیمات پر دو نہایت اہم کتابوں کے مصنف ہیں، اور بالعموم دوسروں کی تعریف کرنے میں کچھ زیادہ سخی بھی نہیں ہیں۔ لیکن ڈاکٹر فاروق صاحب شہید کے بارے میں اُنھوں نے میرے اور جنید کے سامنے یہ کہا کہ مردان کی ملاقات اُن کے دورۂ پاکستان کا حاصل تھی۔ فرید اسحاق بار بار جس بات کا ذکر کر رہے تھے، وہ یہ تھی کہ پاکستان بھر کے اسلامی اسکالرز اور علما میں ڈاکٹر فاروق صاحب واحد آدمی تھے جو AIDS کے

مریضوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ فرید کے بقول اِس میں کچھ دخل تو اُن کی پیشہ ورانہ تربیت کا بھی تھا لیکن اصل محرک اُن کا گہرا اسلامی جذبہ تھا جو کمزور اور دُکھی انسانوں سے محبت کرنا اور اُن کی دل داری کرنا سکھاتا تھا۔

دسمبر ۲۰۰۷ء میں عزیزی خورشید احمد ندیم کی درخواست اور ہم سب کی خواہش پر، وہ میری بھانجی اور بھانجے کے نکاح کی تقریب میں راولپنڈی تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں کے نکاح پڑھائے اور نکاح کی تقریب کے بعد ہمارے سب اہلِ خاندان کی موجودگی میں اسلام میں خاندانی زندگی کی اہمیت اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات پر ایک نہایت دل نشیں تقریر بھی کی۔

اُن سے آخری ملاقات جون ۲۰۱۰ء میں ہوئی جب وہ ایک بار پھر میری درخواست پر اقبال انسٹی ٹیوٹ کی بین الاقوامی کانفرنس میں تشریف لائے جو سوات میں نظام عدل اور نفاذِ شریعت کے موضوع پر تھی۔ بہت محبت سے ملے اور اس بات پر نہایت خوشی کا اظہار کیا کہ میں اب امریکہ سے آ گیا ہوں۔ میں نے کانفرنس میں شرکت پر شکریہ ادا کیا تو کہا کہ آپ بُلائیں اور میں نہ آؤں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حسبِ معمول، کانفرنس میں اُن کی تقریر اپنے تجزیے اور جذبے، دونوں اعتبار سے ممتاز تھی۔ اُنھوں نے سوات اور دیر کے سماجی، مذہبی اور سیاسی پس منظر میں اُن عوامل پر روشنی ڈالی جن کے نتیجے میں ''نفاذِ شریعت'' کی تحریک نے زور پکڑا اور پھر بعد میں یہ تحریک شدت پسندی کے راستے پر چل پڑی۔ تجزیے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے مسئلہ کے حل کے لیے مثبت تجاویز بھی پیش کیں۔ اُن کی اِس تقریر کا انگریزی ترجمہ، ان کی ایک خوبصورت تصویر کے ساتھ، ہمارے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی کتاب ''Toward Revisiting the Deabate on Shariah'' میں شامل ہے۔

کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے میں نے عزیزی ڈاکٹر حسن الامین سے کہا کہ ہمارے اقبال انسٹی ٹیوٹ نے Grassroots کی سطح پر Outreach (عام آدمی تک رسائی) کا جو پروگرام شروع کیا ہے، جس کے تحت ہم چھوٹے چھوٹے شہروں میں سیمینارز منعقد کر رہے ہیں، اس پروگرام کے لیے ہمیں مقررین کا ایک پینل (Panel) طے کر لینا چاہیے۔ ہمارا خیال تھا کہ اِس Panel میں صرف وہی حضرات شامل ہوں جو نہایت عام فہم اور سمجھنے سمجھانے کے انداز میں ایک عام آدمی کو سامنے رکھ کر بڑے موضوعات (Big issues) پر گفتگو کر سکیں۔ جو اونچے منبر پر براجمان ہو کر اپنی علمیت کا رُعب ڈالنے اور سامعین کو جاہل سمجھ کر، اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کر وعظ کرنے کی بجائے محبت اور خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ اُن سے ''گفتگو'' اور مکالمہ کریں اور اسلام اور ملک وملت کو پیش آنے والے بڑے بڑے مسائل پر اُن کو شریک (engage) کریں۔ حسن الامین اور میری، دونوں کی متفقہ رائے میں ڈاکٹر فاروق خان شہید اِس Panel

میں سرِفہرست تھے۔ میں نے عزیزی حسن الامین سے کہا کہ آپ ڈاکٹر صاحب سے بات کریں اور اُن سے وعدہ لیں کہ وہ ہمارے اس پروگرام میں مستقلاً شریک ہوں گے اور ہاں، ڈاکٹر صاحب سے یہ بھی پوچھیے کہ ہم ویسی ہی شان دار دعوت کے لیے اُن کے دولت کدہ پر کب حاضر ہوں، جیسی دعوت اُنھوں نے مجھ سے پہلی ملاقات پر کی تھی۔ حسن الامین نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے پہلی درخواست منظور کر لی اور دوسری کے بارے میں فرمایا کہ ممتاز صاحب جب بھی آنا چاہیں، مجھے خوشی ہوگی اور دعوت بھی ویسی ہی ہوگی۔

— لیکن آدمی کی سب خواہشیں کب پوری ہوتی ہیں؟

ایک رسمی جملہ ہے کہ فلاں کی موت سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے، اُسے پُر کرنا مشکل ہے۔ میں پورے یقین اور صدقِ دل کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ اُن کے بارے میں استعمال کروں تو یہ رسمی جُملہ نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اُن کی شہادت کو قبول فرمائیں اور پاکستان میں اسلام اور ملکی سلامتی، امن اور ترقی کے وہ راستے روشن ہوں جن کے لیے ڈاکٹر فاروق خان شہید خواہش منداور کوشاں تھے۔ آمین



اسلام آزادی رائے اور برداشت کا علم بردار ہے۔ اسلام عقل وفطرت پر یقین رکھنے والا اور اس کی طرف بلانے والا مذہب ہے۔ قرآن مجید ہر انسان کے ضمیر وجدان ذہن اور سمجھ بوجھ کو اپیل کرتا ہے۔ توحید ہو، رسالت ہو یا آخرت، ہر جگہ قرآن عقل عام کی دلیل سے بات کرتا ہے۔ اور مخاطب کو نفسی یعنی انسان کے اندر چھپے ہوئے اور آفاقی یعنی اس پوری کائنات کے اندر پھیلے ہوئے حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ قرآن انسان کو مخاطب ہی اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اختیار وارادہ کی آزادی کا حامل ہے۔ وہ دلیل مانتا ہے۔ اور اپنے فہم کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں دو سو مرتبہ سے زیادہ عقل وفکر، تدبر اور حکمت کے الفاظ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن مجید سرتاسر عقل عام، تدبیر اور دلیل کی کتاب ہے۔ (ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب'' سے ایک اقتباس ۲۹)

محمد عمار خان ناصر*

# ایں آہِ جگر سوزے در خلوت صحرا بہ

ڈاکٹر محمد فاروق خان بھی شہادت کے اس مقام پر فائز ہو گئے جو اس دنیا میں ایک مرد مجاہد کی سب سے بڑی تمنا ہو سکتی ہے۔ پچھلے تیس سال سے ہماری مذہبی اور عسکری قیادت اس خطے میں جو کھیل کھیلتی چلی آ رہی ہے، اس کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندی 'فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة' کی صورت میں اپنے منحوس سایے پوری قوم اور پورے ملک پر پھیلا چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کی بھینٹ چڑھنے والے پہلے فرد نہیں، لیکن انھوں نے ایک مذہبی دانش ور کی حیثیت سے جس جرأت و استقامت اور بے خوفی کے ساتھ اس کے خلاف کلمہ حق مسلسل بلند کیے رکھا، اس کی کوئی دوسری مثال شاید موجود نہیں۔

میری ان سے پہلی ملاقات چند سال قبل غالباً اس وقت ہوئی جب وہ والد گرامی مولانا زاہد الراشدی کی ملاقات کے لیے گوجرانوالہ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ۲۰۰۱ء میں علما کے سیاست میں حصہ لینے، نجی جہاد اور اسلامی ریاست میں زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس کے جواز و عدم جواز کے حوالے سے استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے نقطۂ نظر پر والد گرامی مولانا زاہد الراشدی نے سنجیدہ لہجے میں ایک علمی تنقید لکھی تو ''المورد'' کے حلقۂ فکر کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیا گیا اور جناب معز امجد اور جناب خورشید احمد ندیم نے اس لب و لہجے پر والد گرامی کا شکریہ ادا کیا۔ اس مباحثے میں ڈاکٹر محمد فاروق خان بھی شریک ہوئے اور اسی نے ان کے دل میں والد گرامی کی ملاقات کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ وہ چند دوستوں کے ہمراہ گوجرانوالہ تشریف لائے اور اس سلسلے میں خوشی اور مسرت کے جذبات کا اظہار کیا۔

وسعت نظر اور کھلا پن ان کے شخصی مزاج اور ان کے فکری پس منظر، دونوں کا حصہ تھا۔ ان کی ابتدائی فکری تربیت

* مدیر ماہنامہ ''الشریعہ''۔

جماعت اسلامی کے زیر اثر ہوئی، لیکن مذہبی سیاست کے رخ اور خاص طور پر دور جدید کے سماجی و سیاسی مسائل کے حوالے سے اہل مذہب کی تعبیرات نے ان کے ذہن میں کئی سوالات پیدا کیے جن کا شافی جواب انھیں روایتی مذہبی فکر میں نہیں مل سکا۔ انھوں نے تلاش حق کے جذبے سے ان تمام نقطہ ہاے نظر اور مکاتب فکر کا مطالعہ کیا جو دور جدید میں کسی بھی حوالے سے مذہب کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس فکری سفر کے نتیجے میں انھیں مذہب کی تفہیم وتشریح کے علمی منہج کے حوالے سے دبستان فراہی اور دور جدید کے زندہ مسائل کے حوالے سے اسلامی قانون کی تعبیر نو کے ضمن میں جناب جاوید احمد غامدی کے نتائج فکر نے مطمئن کیا۔ یہ اطمینان حاصل ہونے کے بعد ان کی تمام دینی و دعوتی اور سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا محور ومرکز اسی فکر کا ابلاغ قرار پایا اور وہ گویا اس کی ترجمانی اور ترویج واشاعت کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ تاہم، ان کا یہ اطمینان ایک اصولی اور عمومی نوعیت ہی کا تھا اور اس میں اندھی تقلید کا رنگ موجود نہیں تھا۔ ایک سوچنے سمجھنے والے آدمی کی طرح وہ خود بھی ان نتائج فکر پر غور کرتے رہتے تھے اور مختلف آرا سے خود اختلاف کرنے کے علاوہ اس ضمن میں کسی بھی جانب سے مثبت اور تعمیری تنقید کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان نے سماج اور سیاست کے زندہ مسائل کے بارے میں دینی نقطۂ نظر سے اپنی دعوت قوم تک پہنچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی اور یقیناً ایک بڑے وسیع حلقے تک روشنی کا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہے۔ ان کے فکری سفر نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ اس وقت مسلم امہ کے تمام بنیادی مسائل کی جڑ اس پر طاری فکری جمود میں پیوست ہے اور اس کا واحد حل یہ ہے کہ آزادانہ غور وفکر، مثبت تنقید اور مباحثہ ومکالمہ کی بنیاد پر ایک کھلا ماحول پیدا کیا جائے تاکہ لوگوں کے لیے اپنے اپنے تعصّبات سے آزاد ہو کر حالات اور مسائل کو ان کے درست تناظر میں دیکھنے کا موقع ملے اور سب لوگ کھلے ذہن کے ساتھ ایک دوسرے کے زاویۂ نظر سے استفادہ کریں۔ ماہنامہ ''الشریعہ'' میں ہم نے گزشتہ کچھ عرصے سے اپنی بساط کی حد تک یہی مزاج اور فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر صاحب اس پر ہماری مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے، بلکہ بعض اوقات متفکر ہو کر پوچھتے تھے کہ ''الشریعہ'' نے جو طرز اختیار کیا ہے، وہ ہمارے روایتی مذہبی حلقے کے فکر ومزاج اور ذہنی سانچے کے لیے بالکل اجنبی ہے، اس لیے آپ حضرات اس کو کب تک نبھا سکیں گے؟

ڈاکٹر صاحب مذہبی انتہا پسندی اور خاص طور پر جہادی تنظیموں کے طرز عمل کے سخت ناقد تھے، تاہم یہ اختلاف ہمدردی اور خیر خواہی کا اختلاف تھا اور وہ نظم ریاست کے خلاف برسرپیکار عناصر کو ہر حال میں کچل دینے کے بجائے حکمت اور دانش کے ساتھ انھیں راہ راست پر لانے کی خواہش رکھتے تھے۔ سوات کی تحریک طالبان کی اعلیٰ ترین

قیادت کے ساتھ ان کے ذاتی روابط تھے اور وہ ان تعلقات کو حکومت اور طالبان کے مابین اعتماد کی فضا پیدا کرنے اور دونوں فریقوں کو گفتگو کی میز پر لانے کے لیے استعمال کرنے کی بھی کوشش کرتے رہے، چنانچہ کچھ عرصہ پہلے سرحد حکومت اور تحریک نفاذ شریعت محمدی کے مابین سوات میں امن وامان کے قیام اور نفاذ شریعت کے حوالے سے جو معاہدہ ہوا، اس میں طالبان کی طرف سے سوات میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی شرط بھی رکھی گئی تھی جس کے وائس چانسلر کے طور پر فریقین کے اتفاق سے ڈاکٹر محمد فاروق خان کا نام تجویز کیا گیا۔ یہ ان کے خلوص اور صلاحیت پر فریقین کے اعتماد کا ایک اظہار تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس تعلیمی منصوبے کی ذمہ داری ملنے پر بے حد خوش تھے اور انھیں توقع تھی کہ اس خلوص، محنت اور حکمت کے ساتھ اس منصوبے پر کام کیا جائے تو نہ صرف اس علاقے کے شدت پسند مذہبی عناصر کو اعتدال اور حکمت کے راستے پر لایا جا سکتا ہے، بلکہ یہ ادارہ دینی علوم کے ایسے ماہرین بھی معاشرے کو فراہم کر سکتا ہے جو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ اس توقع اور امکان نے ڈاکٹر صاحب کو بہت پر جوش بنا دیا تھا اور وہ وائس چانسلر کے طور پر اپنے تقرر کے فوراً بعد اس کے تعلیمی پروگرام اور نصاب وغیرہ کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں متحرک ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں بعض دیگر ہم خیال وہم مزاج ساتھیوں کے علاوہ شخصی طور پر مجھ سے بھی رابطہ کیا اور کہا کہ دینی علوم کے شعبے کو صحیح نہج پر استوار کرنے کے لیے وہ مجھے اپنے ساتھ اس کام میں شریک کرنا چاہتے ہیں، اس لیے مجھے اپنی تمام دوسری مصروفیات اور سرگرمیوں کو جیسے بھی اور جس قیمت پر بھی سمیٹنا پڑے، سمیٹ کر سوات منتقل ہو جانا چاہیے۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ سوات میں اسلامی یونی ورسٹی کے قیام کی یہ تجویز کسی باقاعدہ غور و فکر کے نتیجے میں نہیں، بلکہ ایک ہنگامی قسم کے سیاسی معاہدے کے تحت سامنے آئی ہے اور سر دست اس کا مستقبل سرتاسر سیاسی صورت حال پر منحصر ہے، اس لیے اس پہلو کو نظر انداز کر کے جلد بازی میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، اس نوعیت کے خدشات سے ڈاکٹر صاحب کے جوش اور لگن میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی اور یہ منصوبہ آخر دم تک ان کی توجہ اور مساعی کا مرکز رہا۔ بہرحال بعد میں یہ معاہدہ برقرار نہ رہ سکا اور معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ حکومتی رٹ قائم کرنے کے لیے سوات میں ایک بڑا فوجی آپریشن کرنا پڑا۔ آپریشن کی کامیابی اور تحریک طالبان سوات کی طاقت ٹوٹ جانے کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ حکومتی حلقوں میں سوات کی مجوزہ یونیورسٹی کے حوالے سے یہ بحث پیدا ہو گئی کہ اس کی صورت گری ایک عام یونیورسٹی کی طرز پر کی جائے یا اسلامی یونیورسٹی کی نہج پر۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی بیوروکریٹک پیچیدگیوں نے اس معاملے کو الجھائے رکھا تا آنکہ ڈاکٹر فاروق خان کا وقت مقرر آ پہنچا اور وہ یہ

حسرت دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یقیناً وہ آخری آدمی تھے جو اس یونیورسٹی کو اصل منصوبے کے مطابق اعلیٰ دینی تعلیم کی ایک معیاری درس گاہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کے بعد حکومت یا بیوروکریسی کے ذمہ داران سے اس کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے!

ڈاکٹر صاحب انتہا پسند عناصر کی پالیسیوں پر بلا خوف لومۃ لائم اپنے ناقدانہ خیالات کا اظہار ہر فورم پر کرتے رہے۔ انتہا پسند عناصر کے ذہنی سانچے میں درمیان کے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک کوئی شخص یا تو ان کے ساتھ ہوتا ہے یا ان کا دشمن، اس لیے ان سے اختلاف کرنے والا چاہے کتنی ہی ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ایسا کرتا ہو، دشمن کے کیمپ کا آدمی ہی سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ بھی یہی تھا، چنانچہ انتہا پسندوں کی طرف سے ہدف کے طور پر ان کے نام کا اعلان کئی سال پہلے مولانا حسن جان شہید کے نام کے ساتھ کیا جا چکا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کے بعد سے گویا ہتھیلی پر جان رکھ کر اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ سوات کے آپریشن کے بعد خود کش حملوں کے لیے تیار کیے جانے والے جو بہت سے نوجوان پکڑے گئے، سرحد حکومت نے ان کے ذہنوں سے انتہا پسندی کے اثرات زائل کرنے اور درست رخ پر ان کی فکری تربیت کا سلسلہ شروع کیا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب بھرپور اور متحرک کردار ادا کر رہے تھے۔ غالباً ان کے اسی کردار سے مخالفین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور ان کی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ان کی شہادت جرأت و عزیمت، استقامت اور قربانی کا ایک قابل رشک نمونہ پیش کرتی ہے۔ انھوں نے شدید خطرے کے ماحول میں بھی نہ تو اپنے ضمیر کے مطابق کلمۂ حق کہنا چھوڑا، نہ اظہار رائے میں کوئی مداہنت اختیار کی اور نہ اپنی سماجی و دعوتی سرگرمیوں ہی کسی قسم کی کوئی کمی کی۔ ان کی شہادت صرف المورد کے حلقۂ فکر کے لیے نہیں، بلکہ حقیقت میں ملک و قوم، معاشرے اور دینی جدوجہد کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی حسنات اور خدمات کو بہتر سے بہتر اجر کا مستحق بنائیں، ان کی انسانی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرمائیں اور ان کے پس ماندگان کو مصیبت کے اس وقت میں صبر و حوصلہ اور ایمان و استقامت کی نعمت سے بہرہ ور فرمائیں۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه واکرم نزله ووسع مدخله. اللّٰھم اوجرنا فی مصیبتنا واخلفنا خیرا منه. اللّٰھم لا تحرمنا اجره ولا تفتنا بعده۔ آمین

سلیم صافی*

# اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ



پچھلے دنوں بھائیوں جیسے دوست ڈاکٹر محمد فاروق خان کی جدائی نے قلب کو اداس اور فکر کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ لکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ذہن ساتھ دے رہا تھا نہ قلم۔ جس معاشرے میں دوست اور دشمن، کھوٹے اور کھرے کی تمیز اٹھ جائے، وہاں کوئی لکھے تو کیا لکھے اور بولے تو کیا بولے؟ وقاص خان اور اسامہ خان، جن کے باپ ہزاروں یتیموں کا سہارا تھے، وہ خود یتیم کر دیے گئے۔ وہ شخص جس نے کبھی دشمن سے بھی نفرت نہیں کی، نفرتوں کا نشانہ بن گیا۔ وہ جو ہمہ وقت مسکراہٹیں بکھیرتا تھا، ہزاروں کے چہروں سے مسکراہٹ کو غائب کرنے کا سبب بن گیا۔ وہ جو لاکھوں مجنونوں کی شفا کا وسیلہ تھا، خود جنونیت کا شکار ہو گیا۔

بیس سال پہلے عبداللہ عزام کی کتاب ''جنت تلواروں کے سائے میں'' انھوں نے مجھے پڑھنے کو دی، لیکن آج ان کے قتل کی ذمہ داری ''عزام بریگیڈ'' نے قبول کر لی۔ شاید بن لادن کی محبت میں انھوں نے اپنے بیٹے کا نام اسامہ خان رکھا، لیکن انھیں مجاہدین کا مخالف مشہور کر کے مار دیا گیا۔ میں اسلام، پاکستان اور انسانیت سے ان کی والہانہ محبت کا گرویدہ تھا، اکثر لوگ ان کی علمیت کے اور میں ان کی انسانیت کا مداح تھا۔ بعض ان کی سیاست سے متفق تھے، لیکن میں ان کی شرافت کا دیوانہ تھا۔ یہ طالب علم ہو، میجر (ر) محمد عامر ہوں، ڈاکٹر حسن الامین ہوں، ڈاکٹر عامر عبداللہ ہو یا فضل اللہ، سب کو ان کے ہر سیاسی اور عملی فیصلے سے شدید اختلاف تھا۔ سب ہمہ وقت تنقید کرتے، طعنے دیتے تھے، بلکہ ڈانٹتے تک تھے، لیکن سب سے ان کی محبت دیدنی تھی۔ ان کی زندگی انتقام کے جذبے سے خالی تھی۔ حلقے کے ایک دوست ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب دو سو فی صد مسلمان ہیں، لیکن کاش دس فی صد پختون

* کالم نگار روزنامہ ''جنگ''۔

بھی بن جائیں۔ رحلت سے چند روز قبل کی بات ہے۔ میرے ٹی وی پروگرام ''جرگہ'' میں قاضی حسین احمد نے تشریف لانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن جب انھیں علم ہوا کہ شرکا میں ڈاکٹر فاروق خان بھی شامل ہیں (ان کے جنازے کے لیے جمع ہونے والوں سے پہلے خطاب کا اعزاز قاضی صاحب نے حاصل کیا) تو انھوں نے آنے سے معذرت کر دی، لیکن جواب میں ڈاکٹر صاحب کا رویہ یہ تھا کہ جب سیلاب سے قاضی حسین احمد کے گھر کے متاثر ہونے کا علم ہوا تو یوں بے چین تھے کہ جیسے سگے باپ کا گھر ڈوب گیا ہو۔ جماعت اسلامی کے اندرونی اختلافات اور قاضی صاحب کے خلاف ایک معاملے میں جماعت کی نئی قیادت کی انکوائری کی خبر ملی تو بھری محفل میں کہنے لگے کہ قاضی حسین احمد جیسے دیانت دار شخص کے بارے میں اس طرح کا شک زیادتی ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی حکومت میں مولانا صوفی محمد جیل میں تھے۔ ذاتی تعلق، بڑھاپے اور علالت کی وجہ سے یہ طالب علم ان کی رہائی کا مطالبہ کرتا رہا۔ اس کوشش پر بیش تر لوگ مجھ پر لعن طعن کرتے رہے، لیکن پاکستان کے جس ایک فرد نے میرا ساتھ دیا، وہ ڈاکٹر محمد فاروق خان تھے۔ سوات کے طالبان کے سربراہ مولانا فضل اللہ کی والدہ اور بچوں کی رہائی کے لیے انھوں نے اتنی کوششیں کیں کہ ان پر طالبان کا حامی ہونے کا شک کیا جانے لگا۔ ان کی تدفین سے واپسی پر میری اہلیہ حیرت سے کہہ رہی تھی کہ ان کی اہلیہ اور بچوں کا حوصلہ تو بحال تھا، لیکن سیکڑوں کی تعداد میں غریب اور عمر رسیدہ خواتین ان کی لاش پر بے حال ہو رہی تھیں۔ جواباً عرض کیا کہ ڈاکٹر وقاص یتیم ہوئے اور نہ انجینئر اسامہ۔ عظیم باپ کے زیر تربیت وہ کب کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ یتیم تو ان سیکڑوں بیواؤں کے بچے بن گئے، جنھیں باپ بن کر ڈاکٹر فاروق خان کھلا اور پڑھا رہے تھے۔ تبھی ڈاکٹر رضوانہ فاروق کی جگہ وہ ماتم کر رہی تھیں۔

ان کی رحلت کا غم اس قدر تھا کہ زندگی کی کشش ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ ۱۴ اکتوبر کو کابل میں پاک افغان ڈائیلاگ میں شرکت کا ارادہ ہی ترک کر دیا، لیکن ان کے بھائی اور دیگر دوستوں کے اصرار پر رسم قل کے بعد کابل روانہ ہوا، لیکن غم کابل میں بھی ساتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ کانفرنس کے دوران میں بھی ان کا تذکرہ رہا اور وکیل احمد متوکل اور مولوی عبدالسلام ضعیف جیسے دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں میں بھی ان کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھتے رہے۔ کابل کی ایک محفل میں اے این پی کے صوبائی صدر افراسیاب خٹک نے جنرل (ر) اسد درانی اور آفتاب شیر پاؤ کی موجودگی میں کہا کہ ہم ڈاکٹر نجیب اللہ اور گلبدین حکمت یار کی صلح کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس وقت کے افغان انٹیلی جنس کے سربراہ اور اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی کی کامیاب ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں، لیکن ایران اور روس نے آخری وقت پر امن کی اس کوشش کو سبوتاژ کیا۔ حیرت انگیز طور پر افراسیاب خٹک صاحب، حکمت یار کو اچھے الفاظ

سے یاد کر رہے تھے، جبکہ حزب اسلامی کے جس بھی بندے سے میں نے مذکور واقعے کا ذکر کیا تو وہ کف افسوس ملتے ہوئے کم و بیش اسی رائے کا اظہار کرتا رہا۔ کابل ہی میں محمود خان اچکزئی، افغان حکومت کے عہدیدار اور اس طالب علم نے کئی مرتبہ ملا محمد عمر کے سابق دست راست عبدالسلام ضعیف کی اقتدا میں نمازیں ادا کیں۔ آخری روز باغ بابر میں دیے گئے عشائیہ کے میزبان حامد کرزئی کے ہم قبیلہ حکمت کرزئی تھے اور ان کے دائیں بائیں ملا عبدالسلام ضعیف اور مولوی وکیل احمد متوکل بیٹھے ہوئے تھے۔ کابل میں یہ سب کچھ دیکھ کر میں سوچتا رہا کہ نہ جانے ہم کیوں نہیں سمجھ پاتے کہ یہ نظریاتی اور سیاسی اختلافات عارضی ہوا کرتے ہیں۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم جس کے موقف اور حکمت عملی سے اختلاف کر رہے ہوں، وہ دیانت داری کے ساتھ اجتہادی غلطی کا شکار ہو کر اپنے منتخب کردہ راستے کو اسلام، پاکستان اور افغانستان کی بھلائی کا ذریعہ سمجھ رہا ہو۔ فقہی، مسلکی، سیاسی اور نظریاتی اختلافات کی بنا پر ہم اپنے ہم کلمہ بھائیوں کو قتل کرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس طرح آج حزب اسلامی کے لوگ ڈاکٹر نجیب اللہ کو یاد کر رہے ہیں اور جس طرح ڈاکٹر نجیب اللہ کے دست راست افراسیاب خٹک، آج گلبدین حکمت یار کی صلاحیتوں کا اعتراف کر رہے ہیں، ممکن ہے کل اسی طرح کسی روز مولانا فضل اللہ، ڈاکٹر محمد فاروق خان کو یاد کرتے رہیں اور اسفند یار ولی خان، ملا محمد عمر کے خلوص کا اعتراف کرنے لگ جائیں۔ اگر آج حکمت کرزئی اور مولوی وکیل احمد متوکل ایک میز پر بیٹھ سکتے ہیں تو کل حکیم اللہ محسود اور اویس احمد غنی کیونکر ہم سفر بن جانے پر مجبور نہیں ہو سکتے۔ نہ جانے ہم اکابر دیوبند، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان کے نقش قدم پر چل کر شائستگی کے ساتھ اختلاف کا اظہار کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ دلیل کی بنیاد پر بات کرنے والوں کا جواب فتوے یا گولی سے دینے کے بجائے، دلیل سے دیا جائے۔ یاد رکھیے وہ جو جسموں سے بم باندھ کر اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کا خاتمہ کرتے ہیں اور وہ جس نے ڈاکٹر محمد فاروق خان اور ان کے معاون پر گولی چلائی، اصل قصوروار نہیں۔ وہ تو خطے میں جاری گیم کی نزاکتوں سے نابلد لوگ ہیں۔ ان کے ذہنوں میں تو یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ جس کو وہ مار رہے ہیں، وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ حقیقی قاتل وہ لوگ ہیں جو سیاسی اور نظریاتی اختلافات کی بنیاد پر اپنے ہم کلمہ بھائیوں کے ایمان و اخلاص کے بارے میں شکوک پھیلا کر انھیں کبھی امریکہ کا، کبھی ہندوستان کا اور کبھی آئی ایس آئی کا ایجنٹ مشہور کراتے ہیں:

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

طالب محسن

# ایک شہید



موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ یہ جملہ بہت با معنی ہے۔ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کوئی بڑی حقیقت جب الفاظ کا روپ دھار لیتی ہے اور یہ الفاظ جب زبان پر رسمی جملے کی صورت میں جاری ہو جاتے ہیں تو اپنی تاثیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس جملے کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بات کو سنا، دیکھا، سمجھا، مانا، اپنایا اور پوری زندگی کا نقشہ اس حقیقت کے مطابق مرتب کر ڈالا۔

دین سے تعلق کی دو جہتیں ہیں۔ ایک اس پر عمل اور ایک اس کی نصرت۔ یہ دونوں جہتیں جس کی زندگی میں جمع ہو جاتی ہیں، اس کے بارے میں ہم پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے دین کو ماننے اور اپنانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، اس نے نہ صرف زندگی کے روز و شب دین کی تعلیمات کے مطابق کر لیے ہیں، بلکہ اپنی مساعی کا ہدف بھی دین کی حفاظت اور فروغ کو بنا لیا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ ہی کم ہوتے ہیں اور ایسے لوگ اور بھی کم ہوتے ہیں جن کی زندگی کا عنوان ہی دین سے یہ تعلق بن جائے۔

ڈاکٹر فاروق احمد خان ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن پر یہ عنوان ماتھے کے تاج کی طرح چمکتا تھا۔ دنیوی زندگی کی کامرانیاں قدم چومتی تھیں، لیکن انھوں نے ان کے ہاتھ میں اپنا دامن دینے کے بجائے اپنی زندگی کی باگ آخرت کی طرف موڑ رکھی تھی۔ اس خادم دین کے کئی رنگ تھے۔ مصنف، مقرر، داعی، مصلح، واعظ، مکالمہ کار، دانش ور، سیاست کار اور مزید براں دکھی انسانوں کا خادم۔ ان کے کام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بس لکھنے کی میز سے اٹھے تو داعی کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہاں سے اٹھے تو ملک وقوم یا انسانوں کی خدمت کے کسی کام میں جت گئے۔ اس قوم کی کتنی بد قسمتی ہے کہ اس نے ایک ایسے انسان کو زندگی سے محروم کر دیا جو خود اس کی صلاح وفلاح کی ضمانت تھا۔ جس کی زندگی

خوداس کی زندگی تھی۔قومیں شاہراہ حیات پراعلیٰ درجے کے انسانوں کے بل پرمنزلیں مارتی ہیں اوراگرخداانھیں ان سےمحروم کردےتواس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرحلۂ ابتلا میں ہیں۔ہم ابتلا میں ہیں، یہ بات تو ہرعنوان سے واضح ہے ۔فاروق خان کی شہادت سےمعلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتلاختم ہونے کے آثار بھی مٹ رہے ہیں۔

جب فاروق خان کےقتل کی خبرملی تو دل میں بلاتردد اور بلاتوقف یہ خیال آیا کہ وہ شہید ہیں۔اس لیے کہ ان کی زندگی دین کے نام تھی۔اس لیے کہ ان کی موت دین کی خاطرتھی۔

---

اس دنیا میں معاشرتی تبدیلی کا کوئی کام بھی فوری ایکشن کے ذریعے سےنہیں ہوتا۔اگرایسا کیا جائے،تو معاشرہ درہم برہم ہو جاتا ہےاوراصلاح کا کام تخریب بن جاتا ہے۔دراصل جب بھی ایک پرانا آرڈر (پرانی قدریں) نئے آرڈر (نئی قدروں) کے لیے جگہ چھوڑتا ہے،تو درمیانی مدت میں کچھ وقت کے لیے پرانی اورنئی قدریں آپس میں خلط ملط ہوتی رہتی ہیں۔حتیٰ کہ آہستہ آہستہ تلچھٹ بیٹھ جاتی ہےاورصاف وشفاف پانی نتھرکرسامنے آجاتا ہے۔یہی حالت اسلامائزیشن کے پورےطریق کارکی ہےاوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سےہمیں یہی سبق ملتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے سلسلے میں موجودہ معاشرہ،تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے معاشرے کے خاک پا کے برابربھی نہیں۔اگراللہ چاہتا تو فوری طورپرتمام احکام بھجوا کرصحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کوان پرعمل کرنے کی تلقین کرتا،لیکن اس طریق کارسےمستقبل کےمعاشروں کی اسلامائزیشن ناممکن ہوجاتی۔ اوراس وقت کا معاشرہ بھی اتنا درہم برہم ہو جاتا کہ باقی معاشرے کے لیےمسلمان بننا ناممکن ہو جاتا۔یوں تو تدریج کی یہ حکمت ہمیں ہرجگہ نظرآتی ہے،مگردومعاملوں میں تو یہ اتنی واضح ہے کہ اس سےصرف نظرکرنا ممکن نہیں۔ ایک امتناع شراب کا قانون اوردوسرا غلامی کے انسداد کا قانون۔(ڈاکٹرمحمد فاروق خان کی کتاب ’’اکیسویں صدی اورپاکستان‘‘ سےایک اقتباس۳۰۶)

ساجد حمید

# راہِ وفا پر چلنے والے



ماہِ شوال کے آخری ایام میں، ہمارے بھائی ڈاکٹر محمد فاروق خان مرحوم نے جامِ شہادت نوش کیا، اور دارِ فانی سے رخصت ہو گئے[1]۔ راہِ حق پر چلنے والوں کو کبھی کبھی یہ جام نوش کرنا پڑتا ہے، اس لیے کہ اس دنیا کے اسٹیج پر خیر و شر کی باہم ستیزہ کاری ازل سے جاری ہے۔ چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی مسلسل برسر پیکار ہے۔ جب بھی یہ چراغ کسی نے روشن کیا ہے، لوگوں نے سرتوڑ کوششوں سے اسے بجھانے کی کوشش کی ہے ـــــ اس راہ کی سنتِ متواترہ یہی ہے:

راہِ وفا میں ہر سو کانٹے، دھوپ زیادہ سائے کم
لیکن اس پر چلنے والے خوش تھے بہت، پچھتائے کم
دھیمی دھیمی چال میں ہم کو راہ گزر طے کرنی ہے
تیز روی پر ناز تھا جن کو منزل پر وہ آئے کم
قول و عمل کی بات نہ پوچھو، ان دونوں میں فرق بہت ہے
قول و عمل میں ایک ہوئے جو، اس دنیا نے پائے کم[2]

ڈاکٹر صاحب کی شہادت کے اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ جدید و قدیم فکر کے حاملین کی خدمت میں چند معروضات عرض کروں۔ دینِ متین کے احکام میں سے ایک جامع اور بڑا حکم دین کی مدد کرنے کا ہے، جسے اصطلاح

---

1. ''ہم بھی اللہ ہی کے، اور (ایک دن) ہم بھی اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔'' (البقرۃ ۲:۱۵۶)
2. یہ میری ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔

میں نصرتِ دین کہتے ہیں۔ جب دین پر کوئی افتاد آ جائے تو اہل ایمان سے قرآن ان کی استعداد کے لحاظ سے دین کی حمایت کا مطالبہ کرتا ہے۔ سورہ صف میں اس عمل کو اللہ کی مدد کہا گیا ہے[۳]۔ دین کی یہ نصرت کسی بھی صورت میں مطلوب ہو سکتی ہے۔ جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نصرتِ دین کی ایک سب سے نمایاں صورت یہ تھی کہ پیغمبر کا ساتھ دیا جائے تاکہ خدا کا منصوبۂ رسالت روبہ عمل ہو جائے۔ رسول کے اس ساتھ دینے کو دو نام دیے گئے:

۱۔ ساتھ دینا، یعنی صحابی ہونا

۲۔ مدد کرنا، یعنی انصاری ہونا۔

تمام صحابہ اسی ساتھ دینے کی وجہ سے صحابی کہلائے اور سلطان نصیر کی رعایت سے مدینہ کے صحابہ انصار بھی کہلائے ــــ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ ہمیں اس زمانے میں رسول کا ساتھ دینا تو میسر نہیں، لیکن ہم دین کے خدمت گار تو ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ پکار تو آج بھی اسی طرح موجود ہے کہ 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہِ...'

انگریز کی آمد سے ایک دفعہ پھر فلسفہ وفکر کے میدان میں دین پر حملہ ہوا۔ اس کے عقائد اور قوانین معرض اعتراض میں آ گئے۔ اس صورت میں ایسے اذہان کی ضرورت ہوئی جو اس میدان میں اتر کر دین کا دفاع کریں۔ دور اول میں رسول نے پکارا تھا کہ کون میرا ساتھ دے گا؟ آج دین پکار رہا ہے کہ کون ہے جو مجھے سمجھ کر دوسروں کو سمجھائے گا! پچھلی دو صدیوں میں جس کے حساس کانوں نے اس پکار کو سنا، اُسی نے اس پر لبیک کہی، اور میدان میں کود پڑا۔ یہ کودنے والے اکیلے بھی تھے اور اکٹھے بھی۔ کیفیت وہی تھی جو کسی حماسی نے ایک جنگجو قبیلے کی توصیف میں بیان کی ہے کہ:

اذا لقام بنصری معشر خشن

عند الحفیظة ان ذو لوثة لانا

قوم اذا الشر ابدی ناجزیه لهم

طاروا الیه زرفات ووحدانا

''تو تب اس ناموس کی حفاظت کے موقع پر ایک سخت جان لشکر میری مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا، جبکہ بزدل جھک پڑتے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب شر ان پر غراتا ہے تو یہ ٹولیوں میں اور اکیلے اکیلے اس پر پل پڑتے ہیں۔''

اس طرح سے مغربی فکر کے غلط اعتراضات کا جواب دینے کے لیے جب لوگ میدان میں اترے تو جو ہتھیار ان

---

۳۔ الصّف ۶۱: ۱۴۔

کے ہاتھ میں تھا انھوں نے استعمال کیا۔ اس لیے کسی کا ہاتھ صحیح پڑا اور کسی کا غلط۔ لیکن ان غلطیوں کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ سب کی مساعی و جہد کا نشانہ و ہدف ایک تھا کہ نئے فکر کی کاٹ سے اسلام کو بچایا جائے۔ جو لوگ علمی میدان میں خدمت دین کے لیے اترے انھیں نئے فکر کا جواب دینے کے لیے، بعض ایسی باتیں کرنا پڑیں جو نئی تھیں، آیات کی قدیم تفسیر، احادیث کی پرانی شرح، فقہ میں اسلاف کے فتووں سے ہٹ کر باتیں سامنے آنے لگیں۔ جس سے پرانے مسلکی، کلامی، تفسیری تصورات وغیرہ ٹوٹنے لگے۔ ان چیزوں کی وجہ سے اس میدان میں اترنے والوں کو ان لوگوں نے برا سمجھنا شروع کر دیا، جنھوں نے نئے فکری حملے میں جواب دینے کے بجائے یہ روش اختیار کی کہ مغرب کفر لے کر آیا ہے اس لیے کان منہ لپیٹ کر اپنے ایمان کو بچاؤ۔ چنانچہ کفر، زندیقی اور مغرب زدگی کے فتوے، میدان میں اترنے والوں پر لگنے لگے اور ان کے خلاف تنقیدی مضامین، کتابیں اور ہجویہ نظمیں منظر عام پر آنے لگیں۔

ان نئی باتوں میں بلاشبہ کچھ صحیح اور کچھ غلط تھیں، لیکن اس اندھی مخالفت کے بجائے ہونا یہ چاہیے تھا کہ میدان میں اترنے والوں کی مدد کی جاتی اور انھیں ہمدردی، حکمت، موعظت اور مجادلہ احسن کے ذریعے سے سمجھا کر ان کی غلطی دور کی جاتی تاکہ وہ بہتر طور پر مغربی فکر کا مقابلہ کرتے۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن اب یہ ہو گیا ہے کہ اس میدان میں اترنے والا ہر شخص برا ہے۔ جو شخص نئے دور کے لحاظ سے بات کرتا ہے، اسے ماڈرن، مغرب زدہ، ماڈریٹ، لبرل کے القابات سے نواز کر عوام میں ناپسندیدہ بنا دیا جاتا ہے۔

ایسی ناپسندیدگی کا نشانہ وہ مخلص لوگ بھی بن رہے ہیں، جن کی خدمات کا اعتراف آج کا روایتی مذہبی تو شاید نہ کرے، مگر کل کا شخص ضرور کرے گا۔ اس کی ایک اچھی مثال مودودی صاحب مرحوم ہیں، جن کی جم کر مخالفت کی گئی، لیکن اب ان کے مخالفین انھی کی کتابوں سے اکتسابِ علم کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے خلاف ناپسندیدگی کی فضا، نفرت اور دشمنی میں بدل گئی ہے، لہٰذا کچھ لوگ اصحابِ کہف کی طرح روپوشی، کچھ شہدا کی طرح جام شہادت نوش کرنے، اور کچھ ہجرت کرنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ ذرا غور کریں تو اس عمل میں ہوتا کیا ہے، ہوتا صرف یہ ہے کہ کچھ اسلامی بھائی اپنے ایک اسلامی بھائی کو مار ڈالتے ہیں، جو ان کے طریقے سے ہٹ کر اسلام کی خدمت کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا جرم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، تو کیا تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ حنفی، باقی امتیوں سے کچھ مختلف ہوئے، مالکی حنفیوں اور باقی امتیوں سے مختلف ہوئے، پھر شافعی بھی ایسے ہی ظاہر ہوئے، ہمارے دور میں آ کر پاک و ہند میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اور

جماعت اسلامی وغیرہ بھی ایسے ہی امت کے بڑے دھارے سے مختلف نظر آنے والے لوگ ہیں، جو پچھلی دو صدیوں میں ظاہر ہوئے۔اس لیے یہ اگر جرم ہے کہ آدمی باقی امت سے مختلف ہو تو یہ اس وقت کے تمام مکاتبِ فکر کا مشترکہ جرم ہے۔لہٰذا میں (قدیم، جدید اور ماضی قریب کے قدیم) اب مکاتبِ فکر کی خدمت میں چند سفارشات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ دونوں گروہ اپنے اپنے رویے پر نظر ثانی کریں:

ا۔قدیم جدید کی صفوں میں آ کر ان کے مسائل کو سمجھیں اور جدید کی غلطی کی اصلاح حکمت، محبت اور احترام سے کرنے کی کوشش کریں۔جدید قدیم کے اعتراضات کو توجہ سے سنیں، اپنی غلطی ہو تو اسے درست کریں، ورنہ قدیم علما کو حکمت، محبت اور احترام کے ساتھ اپنی بات سمجھائیں۔یوں مل کر نئے چیلنج کا سامنا کریں۔کیونکہ مل کر جب دشمن سے مقابلہ ہوگا تو زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوگا۔

۲۔کسی فریق کی غلطی کو پہلے ہی مرحلے پر کفر ایمان کا مسئلہ نہ بنائیں۔اس لیے کہ غلطی کھانا ایمان کے منافی نہیں ہے۔بندہ مومن سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔بات کو سمجھنے اور سمجھانے میں غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ایسی ہی غلطیاں دین کو سمجھتے سمجھاتے وقت بھی ہو جاتی ہیں۔اسے برادرانہ سطح کا مسئلہ بنا کر صحابہ کے اسوہ پر چل کر حل کیا جائے۔ان میں سے کسی سے غلطی ہو جاتی تو وہ بات چیت کرتے، یہاں تک کہ دوسرا کہتا کہ اللہ نے میرا سینہ اس بات کے لیے کھول دیا اور میں نے اس کی بات مان لی۔گناہ ہو جاتا تو ایک دوسرے کو توبہ کے لیے کہتے، کسی کو کفر ایمان کے فتوے نہ دیتے۔

۳۔دونوں فریقوں کو مستقل طور پر اس بات کے لیے ہوشیار رہنا چاہیے کہ ہماری دین کے ساتھ دوستی بے وقوف کی دوستی نہ ہو۔جو دین کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا نقصان پہنچا دے۔مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسئلہ میں واقعی ہماری بات غلط ہو اور دوسرے کی درست ہو۔اگر ہم اپنی غلط بات پر اصرار کرتے رہیں گے تو اس سے دین کو نقصان ہوگا، اس لیے کہ وہ دین کی بات ہی نہیں ہوگی، لیکن ہم اسے دین کے نام پر پیش کرتے رہیں گے اور مغرب اس کا مذاق اڑا کر ہمارے مذہب کو ہدفِ تنقید بنائے رکھے گا۔

۴۔میدان جنگ میں خدعۃ جائز ہے۔لیکن مذہب کی اس جنگ میں دھوکا، خدا کو پسند نہیں ہے۔دونوں گروہوں کو اس بات میں دیانت دار رہنا چاہیے کہ حق کو فوراً تسلیم کیا جائے۔جب قرآن وسنت کی مراد اور ان کا کہا ہمارے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہو جائے تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کا اقرار کریں۔نہ محض اس وجہ سے انکار کریں کہ یہ مولوی کی بات ہے اور نہ محض اس وجہ سے رد کر دیں کہ یہ مغرب زدہ آدمی کی رائے ہے۔حق حق ہوتا

ہے۔خواہ کسی کی زبان سے صادر ہو۔ یہ راہ حق کی وفاداری کا تقاضا ہے کہ اپنی بنائی ہوئی رائے کے خلاف بھی بات مانی پڑے تو مانی جائے۔

میں نے یہ چاروں نکات قرآن کے ایک حکم کی روشنی میں بیان کیے ہیں[4]، اللہ کا حکم یہ ہے کہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کیا جائے اور حق تلفی، گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کیا جائے۔ میرے خیال میں اس آیت کے حکم کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ہمارا دشمن حق پر ہو، اور ہمارا بھائی ناحق پر، تو بھی ہمیں حق کا ساتھ دینا ہے اور دشمن کے ساتھ کھڑے ہونا پڑے تو بھائی کے خلاف اس کے ساتھ کھڑے ہونا ہوگا۔

آخر پر اپنے ساتھیوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں نے جو صورت اب ہمارے لیے پیدا کر دی ہے اس میں ہمارے سامنے دین کی خدمت کے تین طرح کے اسوہ حسنہ ہیں:

۱۔ اولوالعزم رسولوں کی طرح حق پر قائم رہتے ہوئے دعوت،

۲۔ پھر انھی رسولوں طرح مشکلات کی صورت میں ہجرت،

۳۔ اصحاب کہف کی طرح ایمان بچانے کے لیے روپوشی

یہ تینوں اسوہ قابل تعریف ہیں، ان کی اصل یہ ہے کہ حق کا ترک اور دین کی حفاظت ونصرت سے فرار کسی صورت میں نہیں ہونا چاہیے، اور آگاہ رہنا چاہیے کہ راہِ حق کی روح وفاداری ہے۔ حدیث مبارکہ میں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان کی اصل یہ ہے کہ آدمی ہر طرح کے حالات میں رضیت باللہ ربا، اور رضیت بالاسلام دینا پر قائم رہے۔ ایسا کرنے والا ہی درحقیقت قرآن کا نفس مطمئنہ ہے۔ جس کے لیے قرآن مجید میں اللہ کی طرف سے بڑی دلنواز پکار ہے کہ:

آؤ میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ، اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔[5]

---

[4] المائدہ ۵:۲۔

[5] الفجر ۸۹: ۲۷۔۳۰۔

نعیم احمد بلوچ

# آج سورج جلد غروب ہو گیا!



جب موسم بدل رہا ہو تو یوں لگتا ہے کہ دن کی روشنی جلد ختم ہو گئی ہے۔ آج بھی یہی احساس ہو رہا تھا کہ ابھی کام تو بہت سارے باقی ہیں، مگر لگتا ہے کہ سورج غروب ہونے کو ہے۔ اسی احساس میں تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی نے مجھے گاڑی سڑک کے ایک طرف لگانے پر مجبور کر دیا۔ اور اسی لمحے مجھے ڈاکٹر صاحب کی شہادت کی خبر ملی۔

آج واقعی سورج بہت جلد غروب ہو گیا تھا!

یہ خبر اگرچہ غیر متوقع نہیں تھی، لیکن اتنی اندوہناک تھی کہ دل مان ہی نہیں رہا تھا، انیس مفتی صاحب کو فون کیا، وہی لاہور میں ان کے میزبان ہوتے تھے، انھوں نے تصدیق کی اور تفصیل بھی بتائی۔

اسی لمحے میری آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر صاحب سے آخری ملاقات کا منظر گھوم گیا۔ یہ ایک خصوصی ملاقات تھی، جو انیس مفتی صاحب کے گھر پر ہوئی تھی۔ پہلے تو انھوں نے پیار بھرا گلا کیا کہ میں نے جس موضوع پر تم سے بات کرنی ہے، اس پر ''المورد'' میں ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا تھا اور تمھیں بھی بلایا تھا، مگر تمھیں نہ پا کر حیرت ہوئی تھی، کیونکہ موضوع بچوں کے لیے اسلامیات کا نصاب تھا اور اس میں تمھاری دلچسپی کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔

یہ جنوری یا فروری کی بات تھی جب میں دنیا ٹی وی چینل میں ملازم تھا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے بلال صاحب کے ذریعے سے یہ بات پہنچی تھی کہ آپ قرآن مجید کے ترجمے کے حوالے سے گفتگو کریں گے اور میں شرکت کرنا چاہتا تھا، لیکن انھوں نے مجھے لکچر میں جانے کی اجازت نہ دی۔ تب ڈاکٹر صاحب نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ وہ خیبر پختون خواہ کی حکومت کے ساتھ مل کر بچوں کی دینی تعلیم کے ایک منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ یہ کام بھی شدت پسندوں کو ناپسند ہوگا، لیکن اسے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پھر انھوں نے مجھے اپنی

مرتب کردہ کتب دیں۔ یہ دس کتب تھیں جو قرآنی آیات، احادیث اور بنیادی عقائد وارکان اسلام پر مشتمل تھیں۔ انھوں فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان نصابی کتب کے ساتھ اسلامی تاریخ کے حوالے سے کہانیوں اور بنیادی عقائدوفرائض کی تمثیلی انداز میں وضاحت پر مبنی مضامین کی کتابیں بھی ہوں تاکہ بچے دلچسپی سے اس نصاب کو پڑھیں۔انھوں نے ہمیشہ کی طرح بڑی قدر افزائی کرتے ہوئے کہا کہ یہ چونکہ تمھارا خاص فیلڈ ہے، اس لیے اضافی کتب لکھنے کا یہ کام تم ہی کرو گے اور یہ ہم دونوں کا مشترکہ پراجیکٹ ہوگا۔

اس ملاقات کے بعد ان سے ٹیلی فون کے ذریعے سے مسلسل رابطہ رہا۔انھیں جو کتابیں مرتب کرکے دیں، ان پر انھوں نے بہت زیادہ پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار کیا۔اس ٹیلی فونک رابطے پر گفتگو کے دوران میں ان سے ایک سے زائد مرتبہ اپنے بارے میں محتاط رہنے کی گزارش کی اور انھوں نے ہر دفعہ اس عزم کا اظہار کیا کہ احتیاط کا دامن تھامے ہوئے ہیں، لیکن وہ اپنے مورچے کو چھوڑنا کبھی پسند نہیں کریں گے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے کہ وہ اپنے ان کلمہ گو بھائیوں کی اصلاح بھی چاہتے ہیں۔وہ اس اطمینان کا اظہار بھی کرتے کہ ان لوگوں کے تمام سرکردہ لوگ مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں اور انھیں یہ احساس ضرور ہوگا کہ میں صرف دلیل کی بات کرنا جانتا ہوں۔وہ میرے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔لیکن وقت نے ثابت کیا یہ حسن ظن صرف انھی کی جانب سے تھا۔

وہ جب بھی یہ بات کہتے تو میں سوچتا کہ یہی بات تو ان کے لیے خطرناک ہے۔وہ دلیل ہی کے تو دشمن ہیں۔ان کے نزدیک تو صرف بندوق ہی حرف آخر ہے۔ان کا شمار دنیا کے ان مخالفین میں ہوتا ہے جن کی کوئی اخلاقیات نہیں۔ وہ اپنے ہر مخالف کو ناقابل فہم اور غیر متوقع طریقے سے ختم کرنے کی انتہائی صلاحیت رکھتے ہیں۔لیکن اس ساری تلخ حقیقتوں کو جاننے اور ماننے کے باوجود ان کا ایک ہی موقف تھا کہ وہ اپنا مورچہ نہیں چھوڑیں گے۔

وہ واقعی خان تھے!!

ڈاکٹر صاحب انتہائی فعال انسان تھے۔وہ ایک وقت میں کئی محاذوں پر لڑنے والے مجاہد تھے۔بے رحم قاتلوں نے ان کو صرف اسی لیے خاموش کیا کہ وہ عملی طور پر ان سے شکست کھا چکے تھے۔ان کو شہید کرکے ان ناعاقبت اندیشوں نے گویا یہ مان لیا کہ نظریاتی جنگ میں اصل اور فیصلہ کن ہتھیار کی حیثیت بندوق کو نہیں قلم اور زبان کو حاصل ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا دور جدید کے یہ خارجین ان کے لکھے ہزاروں صفحات اور بولے کروڑوں الفاظ کو بھی ختم کر سکتے ہیں؟

کاش عقل وخرد کے دشمن یہ جان سکیں کہ یہ زمانہ سر نہیں، دماغ فتح کرنے کا ہے، مگر وہ تو محض ناپختہ دماغوں کو ماؤف کر

کے اسے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے قائل ہیں!

جب بھی ڈاکٹر صاحب جیسے مصلحین غارت گروں کا نشانہ بنتے ہیں تو میرے ذہن میں ابن سعد کا روایت کردہ وہ تاریخی واقعہ یاد آجاتا ہے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل ملعون ''عبدالرحمان ابن ملجم'' کو حد جاری کرنے کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ امیر المومنین سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اس سے آخری خواہش کے بارے میں پوچھا۔ اپنے وقت کے اس بدترین دہشت گرد نے کہا تھا کہ اسے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ اس موقع پر بھی انتقام اور غصے کے باوجود متعدد لوگوں کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برداشت اور رواداری ہی کا مظاہرہ کیا گیا۔ امیر المومنین نے اس کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد بھی ابن ملجم کی زہرناک گمراہی کو چین نہ آیا۔ اس نے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی اور کہا کہ اس کی موت تلاوت کرتے ہوئے آنی چاہیے۔ ظاہر ہے اس خواہش کا پورا کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ اسے خاموش کرانا پڑا۔

نہ جانے آج بھی کتنے ابن ملجم ظلم کے اندھے وار کرنے کے باوجود اسی قسم کی سعادت کے خواب دیکھتے ہوں گے۔ لیکن عادل مطلق کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ اس کی عدالت میں کھوٹے سکوں کی کوئی وقعت نہیں۔

ڈاکٹر فاروق خاں اپنی ثابت قدمی ثابت کرتے ہوئے سرخرو ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے ادھورے کام ابھی باقی ہیں۔ کاش انھیں بروقت احساس ہو جاتا کہ موسم بدل گیا ہے، کام ابھی بہت سارے باقی ہیں اور سورج جلد غروب ہو گا!

---

جب ایک مسلمان قوم و ملک کے لیے حالات ناسازگار ہوں، مشکلات زیادہ ہوں اور ہر طرف سے خطرے امڈے چلے آرہے ہوں، تو صبر کا تقاضا ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ انتظار کیا جائے، مستقبل کے لیے منصوبہ بندی اور تیاری کی جائے، اشتعال، فوری ردعمل اور الٹے سیدھے اقدامات سے گریز کیا جائے، پوری پوری دنیوی تدبیر کی جائے۔ یہ طرز عمل اختیار کیا جائے کہ ہمیں بہترین دنیوی حکمت عملی کے مطابق کام کرنا ہے اور اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تیاری کے اس مرحلے میں ثابت قدمی ہی صبر ہے۔ (ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''جہاد و قتال ــــ چند اہم مباحث'' سے ایک اقتباس ۲۲)

محمد بلال

# ’’فاروق‘‘ کی طویل اور ابدی زندگی‘‘



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک دن یہ دین اجنبی ہو جائے گا۔افسوس ہم پاکستانی اس اجنبیت کا شکار ہو چکے ہیں۔اس سنگین صورت حال میں جب کوئی اللہ کا غیر معمولی بندہ دین پر براہ راست، مسلکی تعصب سے بچتے ہوئے، قرآن مجید کو کتاب اور فرقان مان کر غور وفکر کرتا ہے اور اپنے نتائج فکر کو معاشرے کے سامنے پیش کرتا ہے تو تنگ نظری کی کال کوٹھری میں رہنے کے عادی اس روشنی کو برداشت نہیں کر پاتے اور اسے ختم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق خان شہید بھی ایسی ہی روشنی کو پھیلانے والوں میں شامل تھے۔انھیں اپنے انجام کا بھی اندازہ تھا، مگر انھوں نے دین کی اجنبیت کو کم کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ سیانے کہتے ہیں کہ غصہ دلیل نہ ہونے کی علامت ہے۔ڈاکٹر فاروق کے مخالفین کے پاس بھی صرف غصہ تھا۔کون نہیں جانتا کہ غصہ حرام ہوتا ہے۔ چنانچہ غصے کے اظہار کا انجام وہی ہوا، ایک حرام کام کا ارتکاب ہو گیا۔مگر اسی واقعہ کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ہر طرح کی مخالفت کے باوجود ڈاکٹر فاروق، ’’فاروق‘‘ بنے رہے، وہ حق و باطل میں فرق کرتے رہے اور قولی اور قلمی شہادت کی راہ پر چلتے چلتے جانی شہادت دینے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

ہم ’’فاروق‘‘ کے گھر والوں، دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے دنیوی اور انسانی پہلو سے افسوس کرتے ہیں، مگر افسوس سے کئی گنا زیادہ مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ ان کے شوہر، بھائی، باپ، دوست اور ساتھی کو شہید کا درجہ ملا۔ موت سے تو ہر شخص نے ہمکنار ہونا ہے، مگر ایسی شہادت کی موت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ موت اصل میں زندگی ہے، وہ زندگی جس پر ہم جیسوں کی زندگی رشک کرتی ہے۔

قاتل یہ سمجھتے ہوں گے کہ انھوں نے ’’فاروق‘‘ کو مار دیا، مگر شاید انھیں معلوم نہیں کہ پہلے اگر ’’فاروق‘‘ کو

ہزاروں لوگوں نے پڑھنا تھا تو اب کروڑوں لوگ پڑھیں گے اور شہید ''فاروق'' ذہنوں اور دلوں پر دیرا ور دور تک اثر انداز ہوتا رہے گا۔ قاتل اس پر ماتم کریں کہ ''فاروق'' کو دنیا میں طویل ترین اور انتہائی پُر اثر اور آخرت میں اعلیٰ ترین ابدی زندگی عطا ہو چکی ہے:

زندہ ہوجاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

---

تعلیم عام نہ ہونے کی اصل وجہ ہمارا جاگیردارانہ یا بیوروکریٹک طبقہ، مادہ پرستانہ سیاسی نظام اور اس کے نتیجہ میں ملک میں پھیلی ہوئی عام غربت ہے۔ غریب مزارعوں اور ہاریوں کے بچے اگر پڑھنے چلے جائیں، تو غیر مشینی کاشت کاری میں ان کا ہاتھ کون بٹائے۔ ایک غیر صنعتی معاشرہ ہونے کی وجہ سے چونکہ ملک کی آبادی کی اکثریت نہایت مفلوک الحال طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اوائل عمر ہی سے فکر روزگار میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اس لیے ان کے لیے لکھنا پڑھنا پہلی ترجیح نہیں رہتی، چنانچہ سارا ملک بلحاظ مجموعی ناخواندگی کی لپیٹ میں ہے۔ مستقبل میں بھی اس صورت حال کے بدلنے کا زیادہ امکان نہیں ہے۔ میٹرک اور اس سے اوپر تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت بے روزگار پھر رہی ہے۔ اس طرح نہ صرف ان کی، بلکہ پورے معاشرے کی فرسٹریشن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک عام فرد یا بے روزگار نوجوان مریضانہ سوچ اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے کہ جب تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی زندگی کی دوڑ میں ارتقا کا راستہ نہیں کھلتا، تو ایسی تعلیم کا کیا فائدہ۔ اب تو لاکھوں بے روزگاروں کے اس ہجوم میں ماہرین کامرس، ڈاکٹر، انجینئر، ماہرین زراعت، اور ماہرین تعلیم بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف جاگیردارانہ نظام کی گرفت معاشرے پر پوری طرح مضبوط ہے۔ چنانچہ یہ تجزیہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر موجود نظام کو مکمل طور پر تبدیل نہ کیا جائے اور جاگیردارانہ طرز معاشرت کو ختم کر کے ملک کو صنعت اور ٹیکنالوجی کے راستے پر نہ ڈالا جائے، تو شرح خواندگی میں اضافے کا سوال خارج از امکان ہے۔

(ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''اکیسویں صدی اور پاکستان'' سے ایک اقتباس ۱۲۰)

شہزاد سلیم

# ایک مجاہد کی شہادت

ڈاکٹر محمد فاروق خان نے ایک نڈر مجاہد کی زندگی گزاری اور شہادت کی موت سے ہم کنار ہوئے۔ پچھلے کافی عرصہ سے وہ موت سے آنکھیں چار کیے ہوئے تھے، کیونکہ وہ برابر دہشت گردی پر کھلی تنقید کر رہے تھے۔ اس مجاہد کا تمام تر اسلحہ قرآن وسنت کے دلائل پر مبنی تھا۔ موت کی دھمکیاں ان کو ان کے مؤقف سے دست بردار نہ کر سکیں۔ احتیاط کرنے کے مشوروں کو انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ بالآخر وہی ہوا جو متوقع تھا۔ ۲ اکتوبر کو دہشت گردوں نے ان کو ان کے کلینک میں شہید کر دیا۔ وہ شخص جو زندگی میں ہمیشہ مسکراتا ہوا نظر آتا تھا، موت کی حالت میں بھی مسکراہٹ اس کے چہرے پر رونق افروز تھی۔

ڈاکٹر فاروق ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ وہ بے پناہ قوت کار کے مالک تھے۔ اپنے نقطۂ نظر پر ہمیشہ پامردی سے ڈٹے رہتے اور صرف دلیل ہی ان کو اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنے کا باعث بنتی۔ وہ بیک وقت ایک مذہبی اسکالر، دانش ور اور سیاسی لیڈر تھے۔ وہ بہت سے مذہبی ٹی وی پروگراموں کے میزبان رہے اور متعدد ٹی وی پروگراموں میں مہمان مقرر کے طور پر شریک ہوئے۔ وہ ایک مؤثر خطیب بھی تھے اور تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر وہ انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے اور ایک بہت متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہت سے بے سہاروں کا سہارا اور کئی یتیموں کے سرپرست تھے۔ بہت سے غریب طلبا کی تعلیم کا خرچ اٹھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹری کے پیشے کی بھی انھوں نے بے لوث خدمت کی۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان ۱۹۵۴ء میں خیبر پختون خواہ کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں انھوں نے خیبر میڈیل کالج پشاور سے MBBS کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۸۴ء میں سائکاٹری میں University of Vienna

سے ڈپلومہ حاصل کیا۔ وہ جماعت اسلامی کے سرگرم رکن بھی رہے۔ ۱۹۹۱ میں وہ معروف مذہبی اسکالر جاوید احمد غامدی کی فکر سے منسلک ہوئے اور پھر مرتے دم تک ان کے فکر کی تبلیغ و اشاعت میں بھرپور طریقہ سے سرگرم رہے۔ المورد، ادارۂ علم و تحقیق کی مجلس منتظمہ کے بھی وہ ایک عرصہ تک رکن رہے۔ وہ آج کل سوات کی اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

ان کی نمایاں تصنیفات میں ''آسان ترین ترجمہ و تفسیر قرآن مجید''، ''اسلام کیا ہے؟''، ''اسلام اور عورت''، ''جہاد و قتال''، ''حدود و تعزیرات''، ''جدید ایشوز اور اسلام''، ''پاکستان اور اکیسویں صدی''، ''امت مسلمہ''، ''کامیابی کا راستہ'' اور ''مسئلہ کشمیر: ماضی، حال اور مستقبل'' شامل ہیں۔ ان کی ویب سائٹ www.drfarooqkhan.com پر ان کی شخصیت اور کام کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر فاروق بحث و دلیل کے آدمی تھے۔ جب ان کے مخالفین دہشت گردی اور خودکش حملوں پر ان کی تنقید کا جواب نہ دے سکے تو انھوں نے ان کو موت کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اور جب موت کی دھمکیاں بھی ان کو خاموش نہ کر سکیں تو ظالموں نے بندوق کی گولیوں سے ان کو خاموش کر دیا۔ راہ عدم کا یہ مسافر اب اپنی منزل پر فائز المرام ہو کر پہنچ چکا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اس نے موت کے فرشتہ کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا ہو گا اور شاید اس وقت اس کے کانوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ گونج رہے ہوں گے: فزت برب الکعبہ: (رب کعبہ کی قسم، میں کامیاب ہو گیا)۔



---

اسلام میں اس بات کا کوئی تصور موجود نہیں کہ علما کے کسی خاص ادارے کو یہ آئینی حق دیا جائے کہ وہ جس چیز کو اپنے فہم اسلام کے مطابق صحیح سمجھے اسے عوام پر نافذ کرے اور اسے ویٹو پاور حاصل ہو۔ قرآن مجید اس طرح کے ہر تصور سے خالی ہے۔ ایک عالم اپنی اخلاقی طاقت اور اپنے دلائل کی قوت سے عوام کو قائل کر سکتا ہے لیکن اسے یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی کوئی بات جبراً کسی سے منوائے۔ اس کے بالکل برعکس قرآن مجید کا اصول یہ ہے کہ تمام اہم اجتماعی معاملات میں اتفاق رائے پیدا کیا جائے یا اکثریت کی رائے مانی جائے۔

(ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب'' سے ایک اقتباس ۲۳)

کوکب شہزاد

# ڈاکٹر محمد فاروق ـــــ کچھ یادیں، کچھ باتیں



ڈاکٹر محمد فاروق خان ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، مقرر، مصنّف ، مفسّر ، معالج، سوشل ورکر اور ٹی وی پرفورمر۔ ۲۰۰۹ء میں جب میں کسی سیمینار کے سلسلے میں مصر گئی تو وہاں ''Reproductive Health'' کے موضوع پر ان کی کتاب دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایک سال پہلے جب انھوں نے اپنے علاقے میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن سے متاثر ہونے والے علاقوں کے دو سو متاثر خاندانوں کو اپنے علاقے میں ٹھہرا رکھا تھا اور وہ اور ان کی اہلیہ ان لوگوں کے کھانے، پینے اور رہایش کے انتظام میں سرگرم تھے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میری کلاس میں آکر لیکچر دیں، اس موقع پر انھوں نے مجھے جو جواب دیا، اس سے میرے دل میں ان کی عزّت بہت بڑھ گئی۔ انھوں نے کہا: ''میں مردان سے باہر زیادہ وقت نہیں گزارتا کیونکہ مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ اگر رات کو بارش یا طوفان آئے تو ان لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

کچھ سال پہلے ہم لوگ ان کے گھر کچھ دنوں کے لیے مردان میں ٹھہرے، انھوں نے اور ان کی اہلیہ نے زبردست میز بانی کی۔ اس دوران میں ایک بات پر بڑی حیرت ہوتی کہ میز پر کھانا چننے کے بعد وہ دونوں میاں بیوی کھانے والے کمرے سے باہر چلے جاتے، جبکہ ہمارے پنجاب میں تو مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔ بہت دیر بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ شاید وہ اس لیے باہر چلے جاتے ہیں تاکہ ہم بے تکلّفی سے کھانا کھا سکیں۔

ان کی شخصیت کی کتنی پرتیں تھیں، کھلے ہوئے گلاب کی پتیوں کی طرح ان کی شخصیت کے رنگ تھے۔ اسی سال جنوری میں اسلام آباد میں، میں اور وہ ایک سیمینار میں اکٹھے تھے اور نوجوانوں کے مسائل سن رہے تھے اور ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے بتایا کہ میں نے اپنے بچّوں سے کہہ رکھا تھا کہ تم جب

بھی کہو گے، میں تمھاری شادی کر دوں گا، لیکن تم زندگی میں کبھی کوئی غلط کام نہ کرنا۔

ان کا تعلّق ایک ایسے علاقے سے تھا جہاں ابھی تک عورت کو سات پردوں میں رکھنے کو پسند کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عورتوں کی ترّقی اور حقوق کے وہ کس قدر علم بردار تھے، اس کی سب سے بڑی مثال خود ان کی زوجہ محترمہ ڈاکٹر رضوانہ فاروق صاحبہ ہیں جن کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر چلے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ہر لیکچر اور گفتگو میں کسی نہ کسی حوالے سے ان کا ذکر کرتے۔ میں نے اکثر یہ سن رکھا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن بچشم خود دیکھا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے کتنا بڑا سہارا تھے۔

وہ اپنے مریضوں کے ڈاکٹر ہی نہیں، دوست بھی تھے۔ وہ انھیں ملاقات کا وقت بھی زیادہ دیتے اور فون پر بھی ان کی شکایتیں انتہائی تحمّل مزاجی سے سنتے اور آدھی تکلیف تو ان کی تسلّی ہی سے دور ہو جاتی۔ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، مگر اتنا ہی کہوں گی کہ اللہ ان کی شہادت کو قبول فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔



آج کے تمام مسلمان ممالک اقوام متحدہ کے ذریعے سے ایک دوسرے سے معاہدۂ امن میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسلامی لحاظ سے یہ ان پر لازم ہے کہ کسی دوسرے ملک کے خلاف جارحیت نہ کریں۔ آج اقوام عالم کا اجتماعی ضمیر اس مقام تک پہنچ رہا ہے جہاں مظلوموں کی مدد کرنا، تمام دنیا کا فرض بن جاتا ہے۔ یہی قرآن کا پیغام ہے۔ تاہم اب بھی دنیا کے طرز عمل میں بہتری کی بہت گنجائش موجود ہے۔ اگر پوری دنیا اسلام کے تصور جہاد کو اپنا لے تو دنیا سے ظلم وستم کا خاتمہ ہو جائے کیونکہ اسلام میں جہاد صرف اور صرف ظلم کے خلاف ہے۔

(ڈاکٹر فاروق خان کی کتاب ''جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب'' سے ایک اقتباس ۴۴)

محمد راشد

# ڈاکٹر محمد فاروق خان ـــــ ایک مرد مجاہد



ڈاکٹر محمد فاروق خان ـــــ ایک مرد مجاہد، جس نے اپنی زندگی جہالت اور ناخواندگی کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کر رکھی تھی، اس مجاہد کو شہید کر دیا گیا۔ ـــــ ایک بہادر انسان، جو ظالموں کے سامنے کلمۂ حق کہتا رہا، انھیں انسانیت کا اور عدل و انصاف کا درس دیتا رہا، ننگی تلواروں کے درمیان دلیل کا پرچم لہراتا رہا، اس بہادر سے اس کی قوم کو محروم کر دیا گیا۔ ـــــ ایک چراغ راہ، جو بڑھتے ہوئے اندھیروں میں روشنی پھیلانے کی کوشش کرتا رہا، دین کی روشنی، علم کی روشنی، اخلاق کی روشنی، اس چراغ کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیا گیا۔ ـــــ ایک مہربان سرپرست، جس نے یتیم بچوں کی باپ بن کر کفالت کی، ہزاروں دکھی اور بے سہارا انسانوں کو گلے سے لگایا، ان کا غم اپنایا، ان کو سہارا دیا، اس مہربان کو ظلم کا نشانہ بنا دیا گیا۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان نے اپنی ساری زندگی ہنستے مسکراتے ہوئے گزاری۔ ہمیشہ لوگوں میں مسکراہٹیں تقسیم کیں۔ وہ کسی بڑی شخصیت سے مخاطب ہوتے یا عام ملازم سے، ایک تبسم ان کے چہرے پر کھلا رہتا جو مخاطب کو ان کی محبت، شفقت اور انسانیت کا بھرپور احساس دلاتا۔ ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ آتا تھا۔ یہ وصف وہ آخری سانس تک نہ بھولے، اپنے ظالم قاتل کو بھی مسکرا کر دیکھتے رہے۔ یہی مسکراہٹ موت کے بعد بھی ان کے چہرے پر سجی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان انسانیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ انھوں نے زندگی کی نعمت کو بھرپور استعمال کیا۔ اللہ کے دین اور انسانوں کی خدمت کو انھوں نے اپنا مشن بنا رکھا تھا۔ وہ اس مشن کے لیے دن رات کام کرتے تھکتے نہ تھے۔ وہ آخر وقت تک اسی مشن کے لیے سرگرم رہے۔ ان کا جانا ایک بڑا حادثہ، ایک بڑا نقصان ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے دنیا سے

رخصت ہوجانے سے بھی دنیا کے کام رک نہیں جاتے۔اللہ کی مشیت کے مطابق ڈاکٹر فاروق خان کا کام پورا ہوا اور اس نے انھیں واپس بلالیا، وہ جب چاہے گا، ان جیسے اور لوگ پیدا کردے گا جو اندھیروں میں شمع جلاتے رہیں گے، جو گردنیں کٹاتے رہیں گے، جو حق کا پرچم لہراتے رہیں گے، جو اس مشن کو آگے بڑھاتے رہیں گے جس کا عزم ڈاکٹر محمد فاروق خان نے کر رکھا تھا۔

---



یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس وقت جہاں ترقی یافتہ دنیا میں زندگی کی ہر نعمت انسانوں کو میسر ہے۔ جو عام طور پر ان کی ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ وہاں دوسری طرف اس دنیا میں بہت بڑی تعداد میں ایسے غریب لوگ اور مجبور اقوام بھی موجود ہیں جن میں ابھی تک بھوک، ننگ اور جہالت کا دور دورہ ہے۔ جہاں زندگی کی بنیادی ضروریات کی خاطر انسان ترستا ہے۔اس پر مزید تلخ حقیقت یہ ہے کہ ان پس ماندہ ممالک کی معیشت کافی حد تک ترقی یافتہ دنیا کے قبضہ میں ہے۔ان کے بجٹ کا بیشتر حصہ ان قرضوں کے سود کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتا ہے جو انہوں نے مغربی ممالک سے اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے، لیے ہوتے ہیں۔ یوں یہ اقوام غربت و افلاس اور پریشانیوں کے ایک گھن چکر میں قید ہیں جن سے نکلنے کی ان کے لیے راہ بہت محدود ہے۔افسوس ہے کہ اقوام متحدہ نے اس صریح بے انصافی اور امتیاز کے خاتمے کو حقوق انسانی کے چارٹر میں شامل نہیں کیا۔اس حوالے سے حقوق انسانی کا یہ چارٹر نامکمل اور ناقص ہے۔اس دنیا کے آسودہ حال لوگوں اور اقوام کا یہ فرض ہے کہ وہ محروم اقوام کی مصیبتوں کا مداوا کرنے میں ان کی مدد کریں۔

(ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب'' سے ایک اقتباس ۱۰۸)

مرتب: خورشید احمد ندیم

# تاثرات

[ڈاکٹر فاروق خان کی شہادت پر دنیا بھر کے علمی حلقوں اور شخصیات نے اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ ای میل سے موصول ہونے والے بعض تعزیتی پیغام یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔]



## پروفیسر فرید اسحاق

### استاد الٰہیات، یونیورسٹی آف جوہنس برگ، آکلینڈ، ساؤتھ افریقا

میں ایک عظیم شخصیت کی موت پر شدید دکھ کی کیفیت میں ہوں۔ میں پاکستان اور اپنے اس نقصان پر ماتم کناں ہوں۔ ان کے جانے سے ہمارا علمی وفکری افلاس بہت بڑھ گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب! آپ ہماری ان کاوشوں کی صورت میں زندہ رہیں گے جو اس دہشت و وحشت کے خلاف جاری ہیں۔ آپ ہماری اس تمنا کی شکل میں زندہ ہیں جو ہم ایک نئی دنیا کی تخلیق کے لیے رکھتے ہیں۔

## کلاس سپرونک (Klass Spronk)

### پروفیسر عہد نامہ عتیق، پروٹیسٹنٹ تھیالوجی یونیورسٹی، کمپن، ہالینڈ

اپنے عزیز دوست ڈاکٹر فاروق خان کی ناگہانی موت نے مجھے شدید دکھ میں مبتلا کر دیا ہے۔ پچھلے سال ایک کانفرنس میں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ہالینڈ میں بہت سے لوگوں کو بتایا کہ کس طرح وہ قرآن مجید کے تصورِ امن کو عام کر رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے کہ ہم اس کانفرنس کی روداد میں ان کے

خیالات بھی شائع کر رہے ہیں۔ان کے یہ خیالات ان کاوشوں میں معاون ثابت ہوں گے جو دنیا میں تشدد کی حوصلہ شکنی اور امن کے لیے ہو رہی ہیں۔

## لئیق حسن

میں ڈاکٹر فاروق خان کی پر درد موت پر شدید صدمے کی کیفیت میں ہوں۔ میں جب فیس بک پر اپنے ساتھ ان کی تصاویر دیکھتا ہوں تو مجھے اس خبر پر یقین نہیں آتا۔ان کی شخصیت اتنی پرکشش تھی کہ ہم تادیر ان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔یہ امتِ مسلمہ اور بالخصوص پاکستان کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔پختون قوم کے لیے بھی یہ بڑا صدمہ ہے۔

**اکبر ناصر خان،ایم پی پی، امیدوار، HKS، ہارورڈ یو نیورسٹی، امریکا**

ہم نے ایک ایسے شخص کو کھو دیا جو پورے اعتماد اور ایمانی قوت کے ساتھ غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔انھوں نے اپنے استدلال سے بہت سے دلوں کو تبدیل کیا۔انھوں نے اسکالرز اور طالب علموں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔

## محمد عمر قذافی

ریسرچ ایسوسی ایٹ،اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد

ڈاکٹر فاروق خان کی شہادت ایک ایسے مضطرب معاشرے کا نا قابلِ تلافی نقصان ہے جو توازن کی تلاش میں ہے۔اس دکھ کو علمی اور غیر علمی، دونوں حلقوں میں محسوس کیا جائے گا۔وہ جرأت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے والے ایک بے مثل اسکالر تھے۔وہ اقبال کے اس شعر کی مجسم تصویر تھے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

## زیبا میر حسینی

SOAS، یونیورسٹی آف لندن

اس ظلم پر میں شدید صدمے کی کیفیت میں ہوں۔میں جان سکتی ہوں کہ یہ کتنا بڑا نقصان ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ قربانی ضائع نہیں ہوگی اور پاکستانی قوم میں بیداری کا پیغام بنے گی۔

## زینا انور

ڈائریکٹر،مساوات،سسٹرز ان اسلام،سلنگر، ملائشیا

یہ حادثہ ہمارے سامنے یہ افسوس ناک منظر پیش کرتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اور اسلام کے نام پر انتہا پسندی کا عمل جاری ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے شخصی طور پر واقف نہیں تھی، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ ایسے لوگ کتنے کم یاب اور خاص ہوتے ہیں جو بھری مجلس میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت اور سلیقہ رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ عزم کرنا ہے کہ ان کی جدوجہد جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

---

ہمارا دین معیشت کو صرف دنیا ہی سے متعلق چیز قرار نہیں دیتا، بلکہ وہ ہمیں کہتا ہے کہ جس فرد نے بھی اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال و دولت کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کیا، اس کو آخرت میں بلند ترین درجات عطا کیے جائیں گے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں 'انفاق فی سبیل اللہ' کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ مال کی فراوانی بھی اسی طرح کی آزمایش ہے، جس طرح مال کی کمی۔ سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

''اور ہم تمھیں دکھ سکھ سے آزما رہے ہیں، پرکھنے کے لیے اور تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' (۲۱: ۳۵)

(ڈاکٹر فاروق خان کی کتاب ''اکیسویں صدی اور پاکستان'' سے ایک اقتباس ۴۸)

مجیب الرحمٰن شامی*

# ڈاکٹر فاروق خان اوران کی کتاب ''اکیسویں صدی اور پاکستان''



ڈاکٹر محمد فاروق خان کا دل بھی مسلمان ہے،اور دماغ بھی۔ وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک یوں ہیں کہ پیشے کے لحاظ سے نفسیاتی امراض کے معالج ہیں، اور انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں بھی لنگر لنگوٹ کس کر اترے ہیں، اگرچہ کامیابی نے ان کے قدم نہیں چومے، تاہم حوصلہ شکن ناکامی بھی ان کے حصے میں نہیں آئی۔ دینی اور قومی موضوعات پر ان کا مطالعہ تو وسیع تھا ہی، مشاہدے اور تجربے کی دولت سے بھی مالا مال ہو چکے ہیں۔قوم کی اجتماعی نفسیات پر ان کی نظر گہری ہے، اور زیر نظر کتاب گواہی دیتی ہے کہ اس کے علاج پر بھی ان کی توجہ سرسری نہیں ہے۔

ان کے خیالات سے اختلاف کرنے والے بہت ہوں گے لیکن اگر ہم نے اکیسویں صدی میں ایک مضبوط اور توانا مسلمان معاشرے کے طور پر قدم رکھنا ہے تو پھر ڈاکٹر صاحب کے نتائج فکر کی طرف متوجہ ہونا ہوگا۔ بے روح مذہبیت سے نجات بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح مادر پدر آزاد مغربیت سے۔ اسلام کو سیکولر مغرب کے آلات کار کا چیلنج تو درپیش ہے ہی، جامد فقہی ذہن بھی اس کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ بات معلوم ہو جانی چاہیے اور عام ہو جانی چاہیے کہ کٹھ ملائیت اور بد اخلاق مغربیت دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ مسلمان معاشرے اپنی تاریخی توانائی اور مستقبل کی تعمیر کا سامان اسی طرح ڈھونڈ سکتے ہیں کہ ان دونوں کے خلاف جہاد کریں۔

ڈاکٹر فاروق صاحب کی کتاب کا لطف اسے پڑھ کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے معیشت، معاشرت،

---

* ایڈیٹر ''پاکستان'' اخبار۔

قانون، آئین، سیاسی نظام، ٹیکسوں کے ڈھانچے، غرض، ہر اس بات پر بحث کی ہے جس کا تعلق ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ ان کے ہاں اندھی جذباتیت بھی نہیں ہے، اور وہ بے نور دانش سے بھی دور ہیں۔ وہ اعداد و شمار کے حوالے سے بات کرتے، اور مسائل کی گرہیں کھولتے ہیں۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح کی جامع کتاب آج تک کسی پاکستانی صاحب علم کو لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اسے ایک ایسی چابی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس سے ہم مستقبل کے بند دروازوں کو کھول سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کو ماننا ضروری نہیں ہے ان کا یہ مطالبہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہر بات پر غور کرنا ضروری ہے۔ یہ کم سے کم مطالبہ ہے جو ہر اس شخص سے کیا جانا چاہیے جو پاکستان کا درد رکھتا ہے، اور اس کی حالت زار پر کڑھتا ہے۔ اس کے چہرے اور اس کے مستقبل کو بدلنے کی آرزو رکھتا ہے۔

انتخاب: خورشید احمد ندیم

مرتب: عقیل احمد انجم

# فغانِ نیم شبی بےنوائے راز نہیں

[ڈاکٹر محمد فاروق خان شہید کی تصانیف سے چند اقتباسات]



(ڈاکٹر فاروق خان شہید نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا، اُن میں سرفہرست وہ تہذیبی، سماجی اور سیاسی مسائل ہیں، جن کا معاصر مسلمان معاشروں کو سامنا ہے۔ ان موضوعات پر کلام کرتے وقت، ان کا یہ امتیاز نمایاں رہا کہ وہ فکرِ اسلامی کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے، ان مسائل کا ایسا حل تجویز کرتے تھے جو زمینی حقائق سے ہم آہنگ ہونے کے سبب، قابلِ عمل ہوتا تھا۔ بایں ہمہ وہ اپنی بات کو اتنی سادگی کے ساتھ بیان کرنے پر قادر تھے کہ دقیق معاملات بھی ایک عام آدمی کے لیے قابلِ فہم ہو جاتے۔ اس پہ مستزاد مسلمانوں کے لیے ان کی خیر خواہی اور محبت تھی جو ان کی ہر سطر سے نمایاں ہوتی تھی۔ ان کی تنقید اصلاح کے متمنی ایک ایسے شخص کی رائے تھی جو اپنے بھائیوں کے زیاں پر دل برداشتہ اور انھیں ہر طرح کے نقصان سے بچانے کے لیے بے تاب ہے۔ سرسری نظر کے ساتھ ان کی تصانیف سے کیا گیا یہ انتخاب ڈاکٹر فاروق صاحب کے اسلوبِ تحریر کی ان خوبیوں پر بطور شہادت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شہید کی ان کوششوں کو قبول فرمائے اور ان کی تحریریں اُسی احساس کے ساتھ پڑھی جاتی رہیں جس کے تحت یہ لکھی گئیں۔)

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بےنوائے راز نہیں

جب ایک فرد کے لیے حالات ناساز گار ہوں تو دل چھوٹا نہ کیا جائے، اس بات پر یقین رکھا جائے کہ پروردگار تمام حالات کو دیکھ رہا ہے اور وہ جب چاہے گا حالات بدل دے گا۔ چنانچہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا جائے۔ مایوسی اور گھبراہٹ سے بچا جائے۔ حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر، تدبیر کے ساتھ، بہترین پر امن حکمت عملی بنا کر

اس پر عمل کیا جائے۔اور اس عمل پر ثابت قدم رہا جائے۔

اسی طرح جب ایک مسلمان قوم و ملک کے لیے حالات ناساز گار ہوں، مشکلات زیادہ ہوں اور ہر طرف سے خطرے امڈے چلے آرہے ہوں، تو صبر کا تقاضا ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ انتظار کیا جائے، مستقبل کے لیے منصوبہ بندی اور تیاری کی جائے، اشتعال، فوری ردعمل اور الٹے سیدھے اقدامات سے گریز کیا جائے، پوری پوری دنیوی تدبیر کی جائے۔ یہ طرز عمل اختیار کیا جائے کہ ہمیں بہترین دنیوی حکمت عملی کے مطابق کام کرنا ہے اور اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔تیاری کے اس مرحلے میں ثابت قدمی ہی صبر ہے۔

اس کے برعکس ایک فرد یا ایک قوم کی طرف سے فوری ردعمل، جلد بازی، معروضی تجزیے کے فقدان، تیاری کے بغیر اقدام، اور حکمت عملی میں عدم استقلال کو بے صبری کہا جائے گا۔

پچھلے دوسو برس کے دوران میں مسلمان قوم کی سب سے بڑی کمزوری اور خامی بے صبری ہی رہی ہے اور آج بھی اس امت کے رہنما اس کو بے صبری ہی کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ بلکہ ان کی نظر میں صبر کی تلقین کرنے والے دراصل بزدل ہیں۔

تمام پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کی داستان دراصل صبر ہی کی داستان ہے۔ وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ انھوں نے نتائج کے حصول کے لیے جلدی نہیں کی۔ حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین سینکڑوں برس تک اپنی دعوت دیتے رہے، اور مخالفین کے ظلم سہتے رہے، مگر انھوں نے جوابی اقدام کبھی نہیں کیا۔صرف ایک پیغمبر حضرت یونسؑ سے جانب حق جب بے صبری کا ظہور ہوا تو ان کی داستان قرآن مجید نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی۔ارشاد ہے:

فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ اِذۡ نَادٰی وَھُوَ مَکۡظُوۡمٌ. لَوۡلَآ اَنۡ تَدٰرَکَہٗ نِعۡمَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ وَھُوَ مَذۡمُوۡمٌ. (سورۂ قلم ۶۸: ۴۸-۴۹)

’’اس لیے تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کرتے رہو اور اُس مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ، جب اُس نے (مچھلی کے پیٹ میں) پکارا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اگر اُس کے پروردگار کی مہربانی اُس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو (اپنی اس جلدی کے نتیجے میں) وہ اُسی چٹیل میدان میں اِس طرح پھینک دیا جاتا کہ وہ لائق مذمت ہوتا۔‘‘

تمام پیغمبروں کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیشہ صبر ہی سے کام لیا۔مکی دور کے تیرہ سال میں آپؐ نے اپنے اوپر

اور اپنے صحابہؓ کے اوپر کیے جانے والے کسی ظلم کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ ہر زیادتی کے مقابلے میں آپؐ اپنے ساتھیوں کو صبر واستقامت ہی کی تلقین کرتے رہے۔ اگر چہ اس وقت یعنی مکی دور میں بھی مسلمانوں کے اندر ایمانی قوت اور صبر کا مادہ اتنا زیادہ تھا کہ خود قرآن مجید کے مطابق مسلمان اپنے سے دس گنا بڑے لشکر کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ دور مدینہ میں جب ایک اسلامی ریاست وجود میں آ گئی، تب کہیں جا کر مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔

جنگ بدر میں دشمن کی تعداد اور اسلحہ مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھا۔لیکن مسلمانوں نے حضورؐ کی سرکردگی میں ٹھنڈے دل ودماغ سے جنگ کی منصوبہ بندی کی۔ جوش کے مقابلے میں ہوش سے کام لیا اور بہترین جنگی حکمت عملی اپنائی۔ اس کے برعکس دشمن کے ہاں نااتفاقی تھی۔ وہ ایک لیڈر تلے متحد نہیں تھے۔ ان کے ہاں جنگ کے مخالفین بھی تھے۔ ان کے اقدامات بے ترتیبی اور جلد بازی کا مظہر تھے۔ چنانچہ اللہ کی رحمت سے مسلمان فتح یاب رہے۔

جنگ احد میں مسلمان نسبتاً بہتر پوزیشن میں تھے۔ حضورؐ نے بہترین منصوبہ بندی کی تھی۔ اسی لیے ابتداء میں مسلمانوں کو فتح ملی۔ لیکن قرآن مجید کے الفاظ میں جب کچھ مسلمانوں نے بے صبری دکھائی، آپس میں اختلاف کرنے لگے، اور محض مال غنیمت کی محبت کی وجہ سے انھوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی تک کر ڈالی، تو ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے ان کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ (سورۂ آل عمران ۳: ۱۴۴-۱۵۲)

اس کے بعد جنگ خندق (غزوۂ احزاب) میں دشمن کے لشکر کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ وہ متحد تھے اور ان کے پاس اسلحے کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ حضورؐ نے دفاعی حکمت عملی اپنائی۔ اگر چہ اس وقت نوجوان پر جوش صحابۂ کرامؓ کا اصرار یہی تھا کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے، مگر ہوش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ صبر کیا جائے، جذبات کو قابو میں رکھا جائے، مسلمانوں کو بچایا جائے اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دو بدو جنگ سے گریز اور اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر جدید ترین حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے مدینے کے گرد خندق کھودی اور یوں یہ جنگ نہ ہونے دی۔

چھ ہجری میں قریش مکہ نے انتہائی زیادتی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی انھوں نے صلح کی پیش کش بھی کر دی۔ صلح کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے بالکل خلاف تھیں، خصوصاً جس شرط میں کہا گیا تھا کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی اپنے دین کو چھوڑ کر دشمن سے جا ملے، تو اس کو واپس نہیں کیا جائے گا، لیکن اگر مشرکین میں سے کوئی شخص اسلام قبول کر کے مدینہ جائے گا، تو مسلمانوں پر اس فرد کی واپسی لازم ہو گی۔

حضورؐ نے دشمن کی ان ناجائز شرائط پر ان سے صلح کر لی، اس لیے کہ حضورؐ جانتے تھے کہ اس صلح کے نتیجے میں اسلام کی دعوت کا راستہ کھل جائے گا۔ گویا حضورؐ نے دشمن سے امن کا وقفہ خرید لیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بظاہر دب کر کی جانے والی اس صلح کو کھلی فتح اور بڑی کامیابی قرار دیا۔

جب دشمن کی بدعہدی کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ختم ہو گئی تو حضورؐ نے انتہائی صبر کے ساتھ تیاری کا مرحلہ جاری رکھا۔ سفارت کاری کے ذریعے دشمن کو بالکل تنہا کر دیا۔ پھر ایک عظیم فوج لے کر مکہ کو پرامن طور پر فتح کر لیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ صرف دشمنوں کو معاف کر دیا بلکہ انھی کو وہاں کی قیادت بھی سونپ دی۔ غور کیا جائے تو ان واقعات میں موجودہ دور کے مسلمانوں کے لیے صبر و حکمت کا عظیم سبق پوشیدہ ہے۔

اس کے فوراً بعد جب جنگ حنین کا معرکہ پیش آیا تو کچھ مسلمانوں کے دل میں تکبر پیدا ہوا کہ آج ہمیں کون ہرا سکتا ہے۔ چنانچہ پروردگار نے ان کے غرور پر اظہار ناراضی کرتے ہوئے انھیں ابتدائی شکست سے دوچار کر دیا۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب پروردگار دنیوی تدبیر اور صبر کے معاملے میں صحابۂ کرامؓ کی کوتاہی کو بھی برداشت نہیں کرتا تو پھر بھلا وہ ہماری کوتاہی کو کیسے برداشت کرے گا۔ چنانچہ آج امت مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت صبر ہے۔ (جہاد و قتال - چند اہم مباحث ۲۲-۲۴)

☆ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان ملک کے حکمرانوں کے اندر خرابیاں ہوتی ہیں۔ وہ دین کی ہدایات کا خیال نہیں کرتے۔ اُن کی کمزوری، غفلت، یا اُن کے طرز عمل کی وجہ سے ملک کے اندر رشوت، بددیانتی، بے انصافی، بے حیائی اور بدامنی بڑے پیمانے پر موجود ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکمران خود قانون کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ ایسے موقع پر ہر حساس اور درد مند انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح ہونی چاہیے۔ بعض اوقات یہ احساس اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ ایک مسلح گروہ تشکیل دے دے، جو بزور اور طاقت کے ساتھ حکومت کی ان برائیوں کا سد باب کرے۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ ملک میں اچھائیوں کے فروغ اور حکمرانوں کی برائیوں کا سد باب کرنے کے لیے اسلحہ اٹھایا جائے اور اپنے حکمرانوں کے خلاف جنگ کی جائے؟ آج کے زمانے میں یہ سوال بہت اہم بن گیا ہے، اس لیے کہ کئی مسلمان ملکوں میں ایسی مسلح تنظیمیں وجود میں آ گئی ہیں، جو اپنے مقاصد مسلح جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اس معاملے میں اسلام کا جواب بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہ ایک مسلمان ریاست کے اندر، مسلمان حکمران کے

خلاف کسی مسلح کارروائی کی اجازت نہیں۔ اصلاح کی کوشش ضرور ہونی چاہیے، لیکن یہ کوشش خالصتاً پرامن ہونی چاہیے، اور عدم تشدد کے اصول پر ہونی چاہیے۔ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا، اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ. ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا. (سورۂ نساء۴:۵۹)

''اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، اُس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنوں میں سے اپنے حاکموں کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی معاملے میں تمھارے درمیان اختلاف رائے ہو، تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اچھا طریقہ ہے، اور انجام کے لحاظ سے بھی یہی بہتر ہے۔''

یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب قرآن نازل ہو رہا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مسلمانوں کے درمیان موجود تھے۔ چنانچہ جب حضورؐ کے مقرر کردہ حاکموں سے عوام کا کوئی اختلاف ہوتا، تو یہ معاملہ حضورؐ کے سامنے لایا جاتا، اور حضورؐ اُس کا فیصلہ فرما دیتے۔ اُس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ جب حضورؐ اس دنیا میں تشریف فرما نہ ہوں، تو کیا کیا جائے۔ حضورؐ نے اپنے ارشادات کے ذریعے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ مسلمان عوام کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ریاست اور حکومت سے وابستہ رہیں۔ اگر حکمرانوں کے اندر کوئی غلط یا ناگوار بات موجود ہو، اور وہ لوگوں کو اُن کا حق نہ دے رہے ہوں، تو تب بھی اُن کی عمومی اطاعت کی جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

''تم پر لازم ہے کہ تم اپنے حکمرانوں کی بات سنو اور ان پر عمل کرو۔ چاہے تم تنگی میں ہو یا آسانی میں، اور چاہے کہ ماننے کا یہ عمل رضا اور رغبت کے ساتھ ہو یا بے دلی کے ساتھ، اور اس کے باوجود کہ تمھارا حق تمھیں نہ پہنچے۔''

(صحیح مسلم، حدیث نمبر۴۷۵۴)

اسی طرح حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

''جسے حکمران کی کوئی بات ناگوار گزرے، اُس شخص کو صبر کرنا چاہیے، کیونکہ جو شخص ایک بالشت کے برابر بھی حکومت کی اطاعت سے نکلا، اور اسی حالت میں مر گیا، اُس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔''

(صحیح بخاری، حدیث نمبر۷۰۵۳)

اسی طرح حضورؐ نے مزید ارشاد فرمایا:

''جس نے اپنے حکمران کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھی، اُس شخص کو چاہیے کہ صبر کرے، کیونکہ جو شخص

ایک بالشت کے برابر بھی مسلمانوں کی اجتماعی ریاست سے الگ ہوا، اور اسی حالت میں مر گیا، اُس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۷۰۵۴)

درج بالا روایات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حکمرانوں کے اندر خرابیاں موجود ہوں تو ہم صبر کے ساتھ اُن کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں گے، تاہم ہم اپنے حکمرانوں کے احکام کو مانیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ حکمران کی ذاتی خرابیاں، اور حکومتی نظام کی خرابیاں تو اپنی جگہ پر، لیکن اگر کوئی حکمران کسی باشندے کو گناہ کا کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دے، تو ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی حاکم کسی باشندے کو شراب پینے کا حکم دے، تو ایسا شخص کیا کرے۔ اس کا جواب حضورؐ نے یوں دیا:

''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ہر حال میں اپنے حکمران کی بات سنے اور مانے، خواہ یہ حکم اُس کو پسند ہو یا نہ پسند۔ سوائے اس کے کہ اُس شخص کو کسی گناہ کا کام کرنے کا حکم دیا جائے۔ پھر اگر اُس شخص کو گناہ کا کام کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ نہ سنے گا اور نہ مانے گا۔'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۴۷۶۳)

گویا درج بالا حدیث کے مطابق اگر کسی مسلمان کو اپنے حاکم کی طرف سے گناہ کا کوئی کام کرنے کو کہا جائے تو ایسے شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے کسی حکم کو نہ مانے۔ اگر ایسے حکم کو نہ ماننے کے نتیجے میں اس شخص پر حاکم کی طرف سے ظلم ہوتا ہے تو ایسا شخص اس ظلم کو برداشت کرے۔ اس کا اجر و ثواب اُسے قیامت کے دن ملے گا۔ (واضح رہے کہ آج کے زمانے میں کسی بھی مسلمان یا غیر مسلم حکمران کی طرف سے کسی بھی مسلمان کو گناہ کے کسی کام پر مجبور نہیں کیا جا رہا)۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی حکمران اس حد تک خراب ہو جائے کہ وہ اپنی رعایا کو گناہ کا کام کرنے کا حکم دینے لگے، تو کیا ایسے حکمران کے خلاف اسلحہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ حضورؐ نے اس کا یہ جواب دیا کہ جب تک حکمران نماز سے انکار نہ کرے، اور اسلام کو چھوڑ کر کھلم کھلا کفر اختیار نہ کرے، تب تک اُس کے خلاف اسلحہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ عبادہ بن صامت سے روایت ہے:

''نبیؐ نے ہمیں بیعت کے لیے بلایا تو ہم نے آپؐ سے بیعت کی۔ اُس میں جن باتوں کا وعدہ لیا گیا تھا، وہ یہ تھیں کہ ہم اپنے حکمران کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ چاہے یہ رضا و رغبت کے ساتھ ہو یا بے دلی کے ساتھ، اور چاہے ہم تنگی میں ہوں یا آسانی میں، اور اس کے باوجود کہ ہمارا حق ہمیں نہ پہنچے۔ ہم سے یہ وعدہ بھی لیا گیا کہ ہم اپنے حکمرانوں سے اقتدار کے معاملے میں کوئی جھگڑا نہ کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اپنے حکمرانوں سے جھگڑا صرف اُس صورت میں کر سکتے ہو، جب تم اُن کی طرف سے کوئی کھلم کھلا کفر دیکھو، اور تمہارے پاس اس معاملے

میں اللہ کی واضح دلیل موجود ہو۔'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۴۷۷۱)

اسی طرح حضورؐ نے مستقبل کے مسلمان حکمرانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

''تم پر ایسے لوگ حکومت کریں گے جن کی بعض باتیں تمہیں اچھی لگیں گی، اور بعض باتیں بری لگیں گی۔ پھر جس شخص نے اُن کی بری باتوں کو ناپسند کیا، وہ بری الذمہ ہوا۔ اور جس نے اُن غلط باتوں کا انکار کیا، وہ بھی محفوظ رہا۔ مگر جو شخص اُن غلط باتوں پر راضی ہوا اور پیچھے چل پڑا، تو اُس سے (قیامت کے دن) پوچھا جائے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا: جب یہ صورت ہو (یعنی ہمارے حکمران ہمیں گناہ کرنے کا حکم دیں) تو کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے ہوں (تب تک تمہیں جنگ کا اختیار نہیں ہے)۔''

(صحیح مسلم، حدیث نمبر ۴۸۰۱)

یہاں ضمنی طور پر ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو حکمران لوگوں کی مرضی سے منتخب شدہ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اُس میں بڑی خرابیاں ہوتی ہیں، تو ایسے حکمران کی کیا حیثیت ہے؟ حضورؐ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا کہ ایسے حکمران کے خلاف بغاوت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ ارشاد ہے:

''جب تم کسی شخص کی حکمرانی پر جمع ہو (یعنی لوگوں کی اکثریت اُس کے حق میں ہو)، اور کوئی شخص تمہاری جمعیت کو پارہ پارہ کرنے، یا تمہاری حکومت کے معاملے میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے اٹھے، تو اُسے قتل کر دو۔''

یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکمران کے خلاف مسلح بغاوت منع ہے، تو حکمران اور حکومت کی اصلاح کے لیے کیا کیا جائے؟ اس کا جواب حضورؐ نے یہ دیا کہ ایسے حکمران کے سامنے سچی بات کہی جائے۔ ظاہر ہے کہ سچی بات سننے کے نتیجے میں یا وہ اُس بات کو مان لے گا، یا اُس پر آنکھیں بند کر لے گا، اور یا پھر سچی بات کہنے والے شخص پر ظلم کرنا شروع کر دے گا۔ ایسے ظلم پر صبر اور ثابت قدمی کا رویہ اختیار کرنا جہاد کا بہت بڑا درجہ ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ. ''سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے سچی بات کہی جائے۔''

(جہاد و قتال - چند اہم مباحث ۵۴-۵۸)

☆ دین اپنی حقیقت میں دو ہی چیزوں کا نام ہے۔ ایک قرآن مجید اور دوسرا سنت۔ حضورﷺ کی وفات کے بعد ریاستی اور اجتماعی معاملات میں دینی احکام معلوم کرنے کے لیے ایک سادہ اور واضح طریق کار اپنایا گیا۔ وہ یہ کہ ہر معاملے میں پہلے قرآن مجید اور اس کے بعد حضورؐ کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کی جاتی۔ اگر کسی معاملے میں ان

سرچشموں سے ہدایت نہ ملتی، تو اپنی عقل وفہم سے کام لے کر جمہوری طریقے سے فیصلہ کیا جاتا۔ یہی فطری طریقہ تھا اور اسی کو جاری رہنا چاہیے تھا۔ اگر یہ طریقہ کار جاری رہتا اور نئی نئی اصطلاحات وضع کرنے کے بجائے قرآن و حدیث کی اصطلاحات ہی کے ذریعے دین کو واضح کیا جاتا، تو دین کو سمجھنا اور سمجھانا بہت آسان ہوتا۔

حضورؐ کی وفات کے تقریباً ایک سو برس بعد مسلمانوں پر فقہ کے علم کا غلبہ ہوا۔ اس علم کی ابتدا بڑی نیک نیتی سے ہوئی۔ اُس وقت اسلام دنیا کے بہت سے کونوں میں پھیل چکا تھا اور نئے لوگ بڑی تیزی سے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اس لیے کچھ علماء کو یہ خوف لاحق ہوا کہ یہ نئے لوگ جلدی قرآن وحدیث سے واقف نہ ہو سکیں گے، لہٰذا ان کے لیے دین کی ضروریات کو ایک قانونی شکل میں بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح دین کی قانونی ترتیب (codification) کا کام شروع ہوا۔ جب ایک دفعہ یہ کام شروع ہوا تو پھر یہ سلسلہ کہیں پر نہ رکا۔ ہر مکتب فکر نے نئی نئی اصطلاحات وضع کرنی شروع کیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علم کو انتہائی پیچیدہ بنا دیا گیا۔ ہر مکتب فکر نے ہر اصطلاح کی اپنی تعریف متعین کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی اصطلاح سے ایک گروہ کے فقہا کچھ اور مراد لیتے تھے اور دوسرے گروہ کے فقہا کچھ اور۔ جب مختلف مکاتب فکر کے علماء کا آپس میں مکالمہ ہوتا تو یہ پیچیدگی اپنی آخری انتہا کو پہنچ جاتی کیونکہ دونوں طرف سے ایک ہی اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ جب ایک عرصے تک یہ معاملہ جاری رہا تو فقہا کو یہ ڈر ہوا کہ اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ چنانچہ یہ سوچ پروان چڑھی کہ اب مزید بحث واجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں جمود آیا، ہر گروہ اپنی اپنی فقہی آرا پر سختی سے جم گیا اور مسلمان معاشرے میں مذہبی معاملات میں انتہا پسندی اور جمود نے جنم لیا۔

ہمارے لیے آج کے حالات میں یہ ضروری ہے کہ ہم دین کو سمجھنے کے معاملے میں صحابہ کرامؓ کا طرز عمل اختیار کریں۔ وہ یہ کہ ہر چیز میں ہمارے لیے اصل ہدایت کا سرچشمہ قرآن وسنت اور حدیث ہیں۔ اس کے بعد اہل علم نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنے حالات کے مطابق جو رائے ظاہر کی ہے، وہ سب ہمارے لیے بہت قابل قدر ہیں۔ تاہم اُن میں سے کسی بھی بات کی پیروی ہم پر لازم نہیں ہے۔ (جہاد و قتال - چند اہم مباحث ۹۹-۱۰۰)

☆ خودکش حملوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ خوارج نے درحقیقت خودکش حملوں ہی کے ذریعے حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو شہید کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حسن بن صباح، جس نے خراسان کے پہاڑوں میں اپنی حکومت بنا کر قلعہ الموت کو اُس کا مرکز بنا دیا تھا، کا ایک بڑا ہتھیار خودکش حملے ہی تھا۔ اس طرح اُس نے اپنے وقت کے بڑے بڑے بادشاہوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ہلاکو خان نے آ کر اُس کے قلعے کی اینٹ

سے اینٹ بجادی۔

حالیہ زمانے میں، دوسری جنگ عظیم میں، جاپانیوں نے بھی خودکش حملوں سے کام لیا تھا۔ ایک جاپانی پائلٹ بارود سے بھرے ہوئے ہوائی جہاز کواڑاتے ہوئے برطانیہ کے کسی بحری جہاز کی چمنی کے اندر گھس جاتا، اور یوں وہ اپنے آپ کوختم کرتے ہوئے دشمن کا سمندری جہاز اور دشمن کے سینکڑوں سپاہیوں کوغرق کر دیتا۔ اگرچہ اس سے برطانیہ کا بڑا نقصان ہوا، لیکن اصل نقصان جاپان کا ہوا۔ کیونکہ جنگ کے اس طریقے سے جاپان کے پاس پائلٹ ختم ہوگئے، اور یوں اُس کے پاس برطانوی فوج کے ہوائی حملوں کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔

سن اسی کی دہائی میں سری لنکا میں تامل گوریلوں نے بھی خودکش حملوں سے کام لیا۔ تامل گوریلوں کی طرف سے سری لنکا کی حکومت کے خلاف چارسو سے زیادہ خودکش حملے ہوئے، جن میں سینکڑوں فوجی اور سویلین مارے گئے۔ لیکن آخری فتح سری لنکا کی ہوئی، اور تامل گوریلوں کی مکمل شکست ہوئی۔ گویا خودکش حملوں نے تامل گوریلوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

ایک زمانے میں عراق کے اندر بہت سے خودکش حملے کیے گئے۔ مگر وہاں بھی اب یہ سلسلہ بہت کم ہو چکا ہے۔ عراق کی جمہوری حکمت دن بدن مضبوط ہورہی ہے۔ اُس نے اپنی مضبوطی کے ذریعے امریکیوں پر ثابت کر دیا کہ اب عراق میں امن کی بحالی کے لیے امریکی فوج کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ امریکیوں نے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ وہ 2010ء کے آخر تک عراق سے مکمل طور پر نکل جائیں گے۔ عراق میں القاعدہ کی حکمت عملی سو فیصد ناکام ہو چکی ہے۔ اُس نے وہاں سینکڑوں خودکش حملے کروائے، جس میں ہزاروں بے گناہ لوگ قتل ہو گئے۔ لیکن ان خودکش حملوں کا کوئی فائدہ القاعدہ کونہیں پہنچا، اور وہ یہ جنگ ہار گئی ہے۔

پوری دنیا کی تاریخ میں خودکش حملوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکش حملوں سے دشمن کے بجائے خود اپنے آپ کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ وہ یوں کہ خودکش حملوں کے لیے صرف وہی شخص اپنے آپ کو پیش کرتا ہے جو انتہائی پرعزم، باصلاحیت اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو۔ جب کہ ان حملوں میں مرنے والے مخالف قوم کے افراد عموماً عام افراد ہوتے ہیں جو اتفاق سے اجل کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ جب قوم کے باصلاحیت اور پرعزم نوجوان ان حملوں میں کام آجائیں تو پیچھے اوسط درجے کے لوگ ہی بچتے ہیں۔ جاپان نے بھی دوسری جنگ عظیم میں اپنے پائلٹوں کو دشمن کے بحری جہازوں سے ٹکرا کر ایسا ہی غلط فیصلہ کیا تھا، جس کے نتیجے میں اُس کے پاس پائلٹوں کی شدید قلت ہوگئی تھی۔ چنانچہ یہ کوئی صحیح حکمت عملی نہیں۔

خودکش حملوں سے نمٹنے کے لیے مخالف طاقت بھی آہستہ آہستہ حکمت عملی سیکھ لیتی ہیں۔ مثلاً اسرائیل نے یہ سٹریٹیجی اختیار کی کہ خودکش حملہ آوروں کے سارے اہل خانہ کو جیل میں ڈال دیا، پھر ان کو جلاوطن کر کے بے یارو مددگار چھوڑ دیا اور ان کے گھروں پر بلڈوزر چلا دیے۔ اگر چہ یہ بہت ظالمانہ کارروائی تھی۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خودکش حملوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ کیونکہ خودکش حملہ آور سوچتے تھے کہ ہمارے بعد ہمارے اہل خانہ اور پیاروں کو ناقابل بیان اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

خودکش حملے مخالف طاقت کے اندر ایک ایسی نفسیات پیدا کرتے ہیں، جن میں ضد، انتقام اور نفرت شامل ہوتی ہے۔ بسا اوقات خودکش حملے دشمن کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً جب بھارت کے اندر خودکش حملے ہوئے تو سارا بھارت ان حملوں کے خلاف متحد ہو گیا اور سب لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ان خودکش حملہ آوروں کے مطالبات کے سامنے سر نہ جھکایا جائے۔ یوں ان خودکش حملوں سے بھارت کو بحیثیت ریاست بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

خودکش حملوں سے مظلوم قوم کی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور دنیا کے نزدیک ظالم و مظلوم ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ظالم قوم پروپیگنڈے کے زور پر مظلوم قوم کو جارحیت پسند قرار دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ آج تک جتنے بھی خودکش حملے ہوئے ہیں، اُن میں فوجی اور غیر فوجی تنصیبات کا خیال عموماً نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ جب ریستورانوں، مارکیٹوں اور بسوں میں خودکش حملوں سے سویلین مر جاتے ہیں، تو انسانیت کا مجموعی ضمیر ایسی کارروائیوں کو پسند نہیں کرتا اور ان کی مذمت کرتا ہے۔ جب فلسطینی خودکش حملہ آوروں نے پبلک مقامات پر دھماکے کیے، تو اس کے نتیجے میں ظالم اسرائیل کو تو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا، لیکن دنیا کی رائے عامہ کی نظر میں فلسطینیوں کی جائز آزادی کی جدوجہد پر اخلاقی اعتبار سے داغ لگ گیا۔

جب ایک دفعہ خودکش حملوں کو جائز قرار دیا جائے، خواہ وہ کتنے ہی نیک مقصد کے لیے کیوں نہ ہو، تو پھر یہ سلسلہ کہیں پر بھی جا کر نہیں رکتا۔ پھر اس کے نتیجے میں ایک گناہ گار کے ساتھ سو بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ پھر ہر گروہ دوسرے گروہ کو ظالم اور خارج از دائرہ اسلام قرار دیتے ہوئے اُس کے خلاف خودکش حملوں کو جائز سمجھ لیتا ہے۔ اسی وجہ سے عراق میں اہل سنت اور اہل تشیع نے ایک دوسرے کے خلاف خودکش حملے کیے، جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہی کچھ ہوا۔ مختلف مذہبی گروہوں نے ایک دوسرے پر خودکش حملے کیے، جس کے نتیجے میں دونوں طرف کے سینکڑوں لوگ جاں بحق ہوئے۔ اگر چہ ہر حملے کی ابتدا میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ

ان حملوں میں بیرونی ہاتھ ملوث ہے، لیکن تحقیقات کے نتیجے میں ہمیشہ یہ بات سامنے آئی کہ درحقیقت ہر خودکش حملہ ایک مذہبی یا سیاسی گروہ نے اپنے مخالف مذہبی یا سیاسی گروہ کے خلاف کیا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خودکش حملے ایک ایسا پنڈورا باکس ہیں جس کو کھولنے کے نتیجے میں پھر کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

خودکش حملوں کے جواز میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''یہ دراصل ظلم کا ردعمل ہیں، چونکہ مظلوم قوم کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے، اس لیے ان لوگوں کے پاس خودکش حملوں کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا۔ چنانچہ یہ خودکش حملے جائز ہیں''۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ ظلم خواہ کتنا بھی بڑھ جائے، ہمیں اس کے مقابلے کے لیے اللہ نے خودکش حملوں کی اجازت نہیں دی۔ اللہ کا دین تو اس دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ ہمارے اقدامات اور ردعمل کو قابو میں رکھے، اور ہمیں ہر چیز کے حدود اور آداب سکھائے۔ فوری ردعمل ایک طبعی قانون (Physical Law) ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کے لیے روحانی قانون (Spiritual Law) ردعمل کا نہیں بلکہ صبر کا قانون ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ مظلوم اقوام مثلاً فلسطینیوں، عراقیوں، افغانیوں یا کشمیریوں کے پاس کوئی اور راستہ بچا ہی نہیں۔ درحقیقت مزاحمت کا سب سے بڑا ہتھیار عدم تشدد پر مبنی مظلومانہ جمہوری جدوجہد اور آپس میں اتحاد و اتفاق ہے۔ ان دونوں تدابیر سے مظلوم مسلمان اقوام نے کبھی فائدہ اٹھایا ہی نہیں۔ مثلاً فلسطینی اور کشمیری آپس میں بیسیوں تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں اور انھوں نے آج تک ایک متحد اور ایک متفقہ قائد پر اتفاق نہیں کیا۔ اسی طرح اگر آج طالبان مسلح مزاحمت چھوڑ کر جمہوری جدوجہد کا راستہ اختیار کریں تو بہت جلد امریکیوں کو یہاں سے نکالا جا سکتا ہے۔

یہ بات ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ خودکشی جائز نہیں ہے۔ تاہم بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ''جنگ موتہ کے دوران میں، جب کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور مسلمان لشکر کی تعداد کم تھی، مسلمان فوجیوں نے موت پر بیعت کی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے خلاف خودکش حملہ جائز ہے''۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ جنگ موتہ میں مسلمان لشکر، ریاست مدینہ کے حکم پر لڑ رہا تھا۔ موت پر بیعت کا مطلب یہ تھا کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے، لیکن میدان جنگ سے بھاگیں گے نہیں۔ یہ بات قرآن مجید کے اس ارشاد کے عین مطابق ہے جس میں مسلمان لشکر کو میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنے سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہدایت اور اس واقعے کا خودکش حملوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ جنگ موتہ میں کسی مسلمان نے دشمن کے لشکر پر خودکش حملہ نہیں کیا۔ اس جنگ میں صرف گیارہ مسلمان شہید ہوئے۔ عملاً یہ ہوا کہ مسلمان لشکر کے عزم و ہمت کے نتیجے میں دشمن کا لشکر بے حوصلہ ہو گیا اور مسلمان لشکر کے سردار حضرت خالدؓ بن ولید کو یہ موقع مل گیا کہ وہ رات کی تاریکی میں اپنے لشکر کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیں۔ اس

کے بعد دشمن کے لشکر کو مسلمانوں کا پیچھا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ درج بالا تجزیے کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ موتہ کے واقعات اور آج کل کے خودکش حملوں کا آپس میں کوئی موازنہ یا تعلق نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خودکش حملوں کا موجودہ سلسلہ امت مسلمہ کے وسیع تر مفاد میں نہیں ہے اور یہ تدبیر اصولی اعتبار سے بھی غلط ہے۔ (جہاد و قتال - چند اہم مباحث ۱۱۸-۱۲۱)

☆ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے جو جنگیں لڑیں اور ملک فتح کیے۔ ان کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی وفات سے تقریباً چار سال پہلے جزیرہ نمائے عرب کے ارد گرد کے تمام حکمرانوں کو خطوط کے ذریعے سے اسلام کی دعوت دی۔ اور اس کے ساتھ اپنے سفیر بھیجے تاکہ اگر وہ اسلام کو سمجھنا چاہیں تو یہ سفیر ان کو تفصیل سے اسلام کے متعلق بتا سکیں۔ بادشاہوں کو خط لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ملوکیت کا عام دور دورہ تھا۔ رعایا یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ کسی ایسے مذہب کو قبول کر لیں جس کا مخالف ان کا بادشاہ ہو۔ چنانچہ وہاں کی رعایا تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہاں کے بادشاہوں کو اس کی طرف متوجہ کیا جائے۔

ان خطوط کے تین طرح کے براہ راست اثرات ہوئے۔ ایک یہ کہ مخاطب نے اسلام قبول کر لیا۔ مثلاً نجاشی جو حبش کا بادشاہ تھا اس نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسرا یہ کہ حکمران نے اسلام قبول نہ کیا مگر اس پیغام پر غور کرنے کی ہامی بھر لی اور سفیر سے اچھا سلوک کیا۔ اس کی مثال مصر اور بحرین کے بادشاہوں کی ہے۔ تیسرا یہ کہ نہ صرف پیغام کو حقارت کی نظر سے دیکھا بلکہ سفیر سے بھی برا سلوک کیا۔ مثلاً شاہ فارس۔ ظاہر ہے کہ ان ممالک کے اندر عرب سے تجارتی قافلے بھی جاتے رہتے تھے۔ اس لیے اسلام کا نام اور پیغام اس ذریعہ سے بھی پہنچتا رہا۔ نیز چونکہ حکمرانوں کے ذرائع وسائل تو بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لیے وہ اس پیغام سے اچھی طرح متعارف بھی ہوتے رہے۔

جب حضورؐ کی وفات ہوگئی۔ تو اس وقت حالات میں کچھ بنیادی تبدیلیاں آنے لگیں۔ ایک یہ کہ ارد گرد کے حکمرانوں پر تو اتمام حجت ہو چکا تھا مگر ان کے عوام کے لیے دین کا پیغام پہنچانے اور اگر وہ ایمان لانا چاہیں تو ان کے ایمان لانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ دوسرا یہ کہ بعض ہمسایہ ممالک نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے لشکر جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔ تیسرا یہ کہ لوٹ مار کرنے والے کئی قبائلی گروہ اسلامی حکومت میں بدامنی پھیلاتے اور پھر ہمسایہ ممالک میں پناہ لے لیتے۔ یہ تمام حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ ان کا نوٹس لیا جائے۔ اور اس نئی ریاست کو خطرات سے بچایا جائے۔ چنانچہ پالیسی یہ بنی کہ جن ممالک سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا مثلاً حبش، جن کے ساتھ معاہدے ہو سکتے تھے ان سے معاہدے کیے گئے۔ مثلاً بحرین اور مصر اور جو

ممالک کھلم کھلا دشمنی پر اتر آئے ان سے جنگ کی جائے۔

اس طریقہ سے مسلمانوں کے قدم جہاں جہاں پہنچے۔ وہاں اسلام بھی بہت سرعت کے ساتھ پھیلا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو بزور مسلمان بنایا گیا۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے اپنے سابقہ حکمرانوں اور نئے حکمرانوں کے اخلاق و کردار میں اتنا واضح فرق تھا کہ ان کے لیے اسلام قبول کرنا خوشی کا باعث بن گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس پورے دور میں کسی ایک فرد کو بھی جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا۔

(جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب ۴۶-۸۴)

☆ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں جانداروں کی تصویروں کی مکمل ممانعت ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ شرک اور بے حیائی سے پاک ہر تصویر جائز ہے۔ خواہ وہ ہاتھ سے بنی ہو، کیمرے سے لی گئی ہو یا سینما اور ٹی وی کے لیے ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر تصویر حرام ہوتی تو لازماً قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوتا۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت تصویریں موجود تھیں۔ چونکہ قرآن مجید ہی ہمارے لیے معیار ہے اور ہر حلال اور حرام کی بنیاد قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ تصویر کا حکم صاف اور واضح الفاظ میں قرآن مجید میں آتا۔ [اور قرآن مجید میں کوئی ایسا حکم موجود نہیں۔]

اس اصول کی روشنی میں جب ہم احادیث کے اس تمام ذخیرے کا مطالعہ کرتے ہیں جو تصویر کے ضمن میں آتی ہیں۔ تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں سارا معاشرہ شرک سے آلودہ تھا۔ قریش تو خیر تھے ہی مشرکین، عیسائیوں کی عبادت گاہوں میں بھی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے بت اور تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ خانہ کعبہ میں گھوڑوں کی شکل میں ملائکہ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جن کی عبادت کی جاتی تھی۔ حضورؐ نے خود اس بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب چند صحابیات (ابن ام حبیبہؓ اور ام سلمہؓ) مکی دور میں قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئیں۔ تو وہاں انھوں نے عیسائیوں کی عبادت گاہیں دیکھیں جن میں تعظیم و عبادت کی تصویریں تھیں۔ جب وہ وہاں سے واپس آئیں تو ایک موقع پر انھوں نے اس کا ذکر آپؐ سے کیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی صالح شخص فوت ہو جاتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بناتے اور اس میں عبادت کے لیے اس نیک فرد اور دوسرے لوگوں کی تصویریں رکھتے۔ یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق قرار پائیں گے (صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ اور صحیح مسلم، کتاب المساجد)

ان تصویروں میں اصل جرم شرک تھا۔ جس کے بارے میں اسلام کا رویہ بہت سخت ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ [ام المومنین] حضرت عائشہؓ (حضورؐ کی بیوی) نے دروازے پر ایک پردہ لٹکایا جس پر پردار گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ پردار گھوڑے فرشتوں کی علامت تھے، جنہیں مشرکین عبادت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ کو حکم دیا کہ ان پردوں کو اتار دیا جائے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم، کتاب اللباس)

چونکہ عبادت کے مقصد کے لیے تصویریں بنانے والے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ صالح لوگ زندہ اور حاضر و ناظر ہیں۔ خدا کے ہاں ان کے سفارشی ہیں۔ ان کی بات سن سکتے اور ان کی بگڑی بنا سکتے ہیں۔ اس لیے قیامت کے دن ان مصوروں سے کہا جائے گا کہ تمہارے خیال میں یہ تمام بت اور تصویریں حاضر و ناظر ہیں۔ تو اب تم ان کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ ان کے غلط عقیدے کی بنا پر یہ چیز بطور سزا ان سے کہی جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت اپنے شرک کے لیے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ چنانچہ ان تمام روایات میں اصل جرم تصویر کشی نہیں بلکہ شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان روایات میں تصویر اور مصور کا ذکر ''ال'' یعنی اس معرفہ کے ساتھ آیا ہے۔ (بخاری، کتاب التصویر)

چونکہ اس زمانے میں ہر بت کی پوجا کی جاتی تھی۔ ہر ابھری ہوئی قبر کو پوجا جاتا تھا اور ہر ایسی تصویر کی تعظیم کی جاتی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے حضرت علیؓ کو شرک کے یہ تمام مظاہر مٹانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے یہ کام کیا۔ (صحیح مسلم، کتاب الجنائز)

یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں جہاں جہاں شرک کا خطرہ نہیں تھا۔ وہاں آپؐ نے تصویر کی اجازت دی مثلاً ابو طلحہ انصاریؓ صحابی کی یہ روایت کہ جس کپڑے پر تصویر کڑھی ہو (اور وہ شرک سے آلودہ نہ ہو) اس کا پردہ لٹکانے کی اجازت ہے (بخاری کتاب اللباس) اسی طرح جب حضرت عائشہؓ نے تصویر دار کپڑے کو پھاڑ کر اس سے گدا بنالیا۔ (اور اس طرح اس کے شرک کا اظہار ختم کر دیا) تو حضورؐ نے اسے بچھانے سے منع نہ کیا (مسلم کتاب اللباس) اسی طرح سالمؓ بن عبداللہ (صحابی رسول) سے یہ روایت ہے کہ اس تصویر کی ممانعت ہے جو (تعظیم و عبادت کے طور پر) نمایاں مقام پر نصب کی گئی ہو۔ اس تصویر کی ممانعت نہیں جو کسی عام جگہ میں موجود ہو (مسند احمد)

درج بالا بحث سے یہ بات کھل کر واضح ہوتی ہے کہ اگر احادیث کا قرآن مجید کی واضح ہدایت کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو ان کا صحیح مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ان کی صحیح اور تسلی بخش وضاحت بھی سامنے آجاتی ہے اور مختلف روایات میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے۔ اس کی بھی اطمینان بخش تشریح ہو جاتی ہے۔ چونکہ تصویر اتنی فطری چیز ہے اس لیے اسے ناجائز سمجھنے والوں کو بھی اس معاملے میں بے شمار مستثنیات دینی پڑی ہیں۔ مثلاً شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کی

تصویر، کارٹون، دینی اور سیاسی جلسوں کی تصویر تعلیمی مقاصد کے لیے تصویر وغیرہ وغیرہ بلکہ صحیح صورت حال تو یہ ہے کہ اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ لگانے والوں نے بھی اسے عملاً ہر مباح کام کے لیے جائز کرلیا ہے۔

(جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب ۱۱۰-۱۱۳)

☆ آج کے حالات میں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے پہلو بہ پہلو جینے کا سوال انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ جہاں یہ بات واضح ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے۔ دونوں کے مقاصد زندگی اور اقدار زندگی میں فرق ہے، وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کئی معاملات میں دونوں تہذیبوں کے درمیان محض غلط فہمیوں کی ایک دیوار کھڑی ہے۔ خصوصاً ان معاملات میں جن کا تعلق ان دونوں تہذیبوں کے پہلو بہ پہلو جینے سے ہے؛ اور اگر یہ غلط فہمیاں نہ رہیں تو دونوں تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی اور پرامن بقائے باہمی کی فضا جنم لے سکتی ہے۔

اس وقت مسلم دنیا میں مغرب کے متعلق تین قسم کے رویے موجود ہیں۔ ایک رویہ انتہا پسندانہ ذہنیت کا ہے۔ جو مغرب کو مجموعہ شر قرار دیتا ہے۔ جس کے خیال میں سارا مغرب خلاف اسلام ہے۔ لہٰذا دونوں کے درمیان ابدی دشمنی ہے۔ مسلم دنیا کے اندر یہ ذہنیت اقلیت میں ہے۔ مگر اس کی مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔ اسی ذہنیت کو مغرب عام طور پر بنیاد پرستی کے نام سے پکارتا ہے۔

دوسرا رویہ مرعوبیت کا ہے۔ اس ذہنیت کے خیال میں اصل معیار مغرب ہی ہے۔ مغربی اقدار ہی عظیم ترین ہیں۔ اس ذہنیت کے علم بردار مسلم دنیا کے بالادست طبقات میں موجود ہیں۔ تاہم بلحاظ مجموعی یہ طبقہ مسلم دنیا کے لیے اجنبی ہے۔ کیونکہ یہ ان کے اجتماعی ضمیر کے خلاف ہے۔

تیسرا رویہ اعتدال کا ہے۔ اس ذہنیت کے خیال میں اگرچہ اسلام اور مغرب کے درمیان بنیادی تضادات موجود ہیں؛ تاہم دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کی ایک ایسی دیوار بھی موجود ہے جسے دور کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح پرامن بقائے باہمی ممکن ہے۔ مسلم دنیا میں یہی طبقہ بڑی اکثریت میں ہے۔

اس کے بالمقابل مغرب میں بھی اسلام اور مسلم دنیا کے متعلق تین رویے موجود ہیں۔ ایک رویہ اسلام دشمنی کا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کو مغرب دشمنی کا علم بردار گردانتا ہے۔ اس ذہنیت کے خیال میں مغرب کی نجات صرف اس میں ہے کہ اسلام کو مکمل شکست سے دوچار کیا جائے۔ اور مسلم دنیا کے اندر صرف وہی قیادت ابھاری جائے جو آنکھیں بند کر کے مغرب کی اقدار کی تقلید پر یقین رکھے۔ یہ طبقہ اسلام کے خلاف کسی بھی پروپیگنڈا کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

دوسرا طبقہ اسلام دشمن تو نہیں، لیکن یہ مسلمانوں کو بلحاظ مجموعی تاریک خیال، ترقی دشمن، جمہوریت دشمن اور پس ماندہ سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کے متعلق گومگو کا شکار رہے۔ مغرب کا سیاسی طبقہ یہی ذہنیت رکھتا ہے۔ اس لیے مسلم دنیا کے متعلق اس طبقے کی ترجیحات اور حکمت عملی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس طبقہ کے خیال میں مسلمان حکومتوں کو اپنے پنجے کے اندر رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ مغرب کے لیے خطرہ نہ بننے پائیں۔

تیسرا طبقہ مسلم دنیا کے لیے ہمدردانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقہ کے خیال میں مسلمانوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ وہ اتنے برے نہیں جتنا کہ ذرائع ابلاغ انھیں پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ مغرب کو اپنے تضادات کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ مسلم دنیا کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو افسوس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اگر مغرب، مسلم دنیا کی طرف دوستی کا حقیقی ہاتھ بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اسے مثبت جواب ملے گا۔

(جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب ۱۳۱-۱۳۳)

☆ تمام مغربی فلاحی مملکتیں ہر معاملے میں دوہرا معیار رکھتی ہیں۔ اپنے ملکوں کے اندر وہ تمام معاملات میں سچائی، امانت، دیانت اور محنت سے کام لیتی ہیں۔ خود فلاحی مملکتیں آپس میں بھی ایک دوسرے سے معاہدے کرتے وقت تمام اخلاقی اصولوں کا خیال رکھتی ہیں، لیکن تیسری دنیا کے غیر ترقی یافتہ ممالک سے سودے کرتے وقت ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ ساری ملٹی نیشنل کارپوریشنز، تیسری دنیا کے ذمہ دار ترین افراد کو رشوت کے ذریعے سے اپنا ہمنوا بناتی ہیں اور سودوں، سمجھوتوں اور ٹھیکوں میں لاکھوں، کروڑوں ڈالر بطور کمیشن ادا کرتی ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت یہ ہے کہ بعض ایسے اصول، جن پر ساری دنیا کے اہل علم متفق ہیں، یعنی جمہوریت، اگر کسی ملک میں جمہوریت کے ذریعے سے ایسے گروپوں کے برسر اقتدار آنے کا خدشہ ہو، جن کے عمرانی نظریات مغرب سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، تو وہاں بالواسطہ یا بلاواسطہ، آمریت اور ظلم و بربریت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ یہ بات خصوصی طور پر عالم اسلام پر صادق آتی ہے۔ جب برما میں انتخابات کے بعد فوجی حکمرانوں نے انتقال اقتدار سے انکار کیا، تو تمام مغربی حکومتوں اور ذرائع ابلاغ نے اس کی مذمت کی اور ابھی تک یہ معاملہ حکومتوں اور ذرائع ابلاغ کی حد تک زندہ ہے، مگر دوسری طرف جب الجزائر میں، اسلامک سالویشن فرنٹ، نے جمہوری انتخابات جیت لیے اور وہاں بھی فوج کی طرف سے انتقال اقتدار سے انکار کیا گیا، تو مغربی حکومتوں اور ذرائع ابلاغ نے بالکل چپ سادھ لی اور اس کی مذمت میں ایک دو نحیف و نزار آوازوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں اٹھی، یعنی بالواسطہ سب نے فوجی اقدام کی حمایت کی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اور اس میں اس کے کون سے ''اسٹریٹجک'' مفادات پوشیدہ ہیں، جن کی بنیاد پر وہ اپنے ہی اصولوں کی دھجیاں اڑا کر بدترین منافقت کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے، اس لیے کہ اسی سوال کے جواب پر مشرق و مغرب کے آیندہ تعلقات کا انحصار ہے۔

اس وقت دنیا میں ایک ترقی یافتہ فرد کے مقابلے میں چھ پس ماندہ افراد موجود ہیں۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ چھ پس ماندہ افراد مسلسل محنت کریں اور اپنے آپ کو پس ماندہ رکھیں؟ تو تب یہ ایک فرد ترقی یافتہ بھی رہے اور معاشی اعتبار سے مطمئن اور خوش حال بھی۔ یہ چھ افراد خام مال بھی پیدا کرتے ہیں اور ترقی یافتہ دنیا کی بنائی ہوئی چیزیں مہنگے داموں خرید کر انھیں استعمال بھی کرتے ہیں اور اپنے دفاع کے لیے بھی، انھیں مغرب ہی پر تکیہ کرنا پڑتا ہے، لہٰذا ایک اعتبار سے یہ سب مغرب کے حلقۂ غلامی میں شامل ہیں۔ اب اگر کسی وجہ سے ٹیکنالوجی کی منتقلی عمل میں آئے، اور سائنس اور انڈسٹری پر مغرب کی اجارہ داری ختم ہو، تو مغرب کو ڈر ہے کہ اس کا عظیم معیار زندگی برقرار نہیں رہ سکے گا، لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ یہاں 'سٹیٹس کو' (Status quo) رہے اور یہ ممالک پس ماندہ ہی رہیں۔ مغرب غیر ترقی یافتہ ممالک کو زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دے سکتا ہے کہ وہ زراعت میں تھوڑی سی ترقی کریں یا کچھ ایسی انڈسٹریز لگا لیں، جن کا مغرب کے لیے لگانا اب مزید سودمند نہیں، تاکہ ''قوت لایموت'' کا سلسلہ بھی جاری ہو اور کہیں یہ لوگ مکمل طور پر بھوکے ننگے بن کر بغاوت پر نہ اتر آئیں۔

اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مغرب نے ایک اور حکمت عملی سے بھی کام لیا ہے۔ وہ یہ کہ مغرب نے تمام پس ماندہ ممالک میں اپنا ایک ممنون احسان مراعات یافتہ طبقہ پیدا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے مغرب کو اب یہاں اپنے مفادات پر نظر رکھنے کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ یہ مراعات یافتہ طبقہ اس کے تمام مقاصد پورے کر رہا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مغرب نے تیسری دنیا کے حکمرانوں کو دل کھول کر قرضے دیے۔

یہ قرضے جان بوجھ کر ایسی مدوں کے لیے دیے گئے کہ اس کا سارا فائدہ برسر اقتدار طبقے کو پہنچے اور اس کے ذریعے سے سرمایہ داروں کی ایک کلاس وجود میں آجائے اور عوام کو اس کا فائدہ نہ ہونے کے برابر ہو۔ ان قرضوں کے ساتھ رشوت اور مغربی ممالک کے دوروں کا ایک پروگرام بھی ترتیب دیا گیا، تاکہ یہ طبقہ مغرب سے مسحور و مرعوب ہو کر ہمیشہ اس کے گن گائے، اور ہر معاملے میں رہنمائی کے لیے ان کی طرف دیکھے۔ اس وجہ سے اس نئے طبقے کا معیار زندگی اپنے ہی ملک کے عوام کے مقابلے میں اتنا اونچا ہو گیا کہ اب وہ اس میں کسی کمی کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور وہ اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اب اگر ان کو بحیثیت طبقہ اپنا معیار زندگی برقرار رکھنا ہے، تو اس کے لیے یہ ضروری ہے

کہ وہ اپنے عوام کو ترقی کے ثمرات نہ پہنچنے دیں، ان کو ہمیشہ محروم اور اپنا دست نگر رکھیں ۔ چنانچہ مغرب کا ایجنٹ پس ماندہ ممالک کا سربرآوردہ طبقہ اپنے تاریخی فرض کو بہ طریق احسن پورا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام، جس کی کوکھ سے مغرب میں فلاحی مملکتوں کے بہترین نظام نے جنم لیا، ہمارے یہاں فلاحی مملکتوں کی پیدایش 'Genesis' کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

مغرب نے اپنے اس جال کو مزید پھیلایا اور اس سربرآوردہ طبقے کو، مستقل طور پر، حکمران رکھنے کے لیے یہاں ایک ایسے انداز جمہوریت کو رواج دیا، جس میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں اطراف سے یہی طبقے سامنے آئیں۔ اپنے لیے تو انھوں نے عام طور پر متناسب نمائندگی کا نظام پسند کیا، مگر یہاں حلقہ بندیوں پر مبنی ایک ایسا نظام بنایا گیا، جس میں الیکشن لڑنے کے اخراجات اتنے زیادہ ہو جاتے ہیں کہ بہت بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے علاوہ کوئی فرد اس کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ افراد جس طرف سے بھی آئیں گے، اپنے ہی طبقے کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ بعض اوقات متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد بھی اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں مگر ان کے پیچھے سرمایہ داروں کی لابیاں کام کرتی ہیں، لہٰذا یہ افراد پارلیمنٹ میں پہنچ کر وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جو ان کو آگے لانے والی لابیاں چاہتی ہیں۔

حلقہ بندیوں کے اس طریق کار سے سارے ملک میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ''خدا'' بن جاتے ہیں، جن کے سارے مفادات اس پورے نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ تمام ''خدا'' لوگوں کے معمولی معمولی مسائل حل کرتے ہوئے انھیں نظام کی تبدیلی کی بات سے غافل رکھتے ہیں، لہٰذا ڈھانچہ اور نظام تبدیل ہوئے بغیر جمہوریت کا ایک ڈھونگ جاری رہتا ہے اور دو بڑی پارٹیوں میں کسی کے بھی برسر اقتدار آنے کی صورت میں ان کے مغربی آقاؤں کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوتا۔ بقول اقبال:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

گرمئ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

چنانچہ مغرب کی اس حکمت عملی کے اعتبار سے پس ماندہ ممالک میں تین گروپ بن جاتے ہیں۔ ایک مستقل حکمرانوں (Born Rulers) کا گروپ، جس میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہوتے ہیں۔ یہ گروپ مغرب کے عالمی مفادات کی بڑی وفاداری سے حفاظت کرتا ہے۔ دوسرا عوام کا گروپ، جو اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے حکمرانوں کا دست نگر رہتا ہے۔ تھانہ، تحصیل، کچہری، ہسپتال، بینک، ہر جگہ اونچے طبقے کی بات چلتی ہے، لہٰذا جب وہ ایک عام فرد کا کوئی چھوٹا سا مسئلہ حل کرتے ہیں، تو وہ ہمیشہ کے لیے ان کے احسان مند بن کر ان کے ووٹ بینک کا کام دیتے ہیں۔ تیسرا طبقہ دانش وروں پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں جو لوگ حکمران طبقے کی خرید و فروخت سے بچ جاتے ہیں اور جنھیں اپنے حقیقی کردار کا شعور ہوتا ہے، وہ اخبارات و رسائل کے ذریعے نظام پر تنقید میں لگے رہتے ہیں۔ یہ کام بھی مغرب کے لیے ایک اعتبار سے مفید ہے اس لیے کہ اس مشق کے ذریعے سے نظام کو کوئی نقصان پہنچے بغیر، اس طبقے کے دل کی بھڑاس نکلتی رہتی ہے۔ مغرب میں جس طرح دانش وروں نے عوام کی رہنمائی کی تھی، بدقسمتی سے یہاں بہت سے عوامل کی وجہ سے ایسا اب تک ممکن نہیں ہوا۔

مغرب کی اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج پس ماندہ اقوام کی حکومتیں، یہاں کی سیاست، یہاں کی معیشت اور یہاں کا دفاع سب کچھ مغرب کے ہاتھوں گروی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان تمام طبقات کو مغربی مفادات پورے کرنے کے اپنے کردار کا شعور ہو، بلکہ محض یہ خوف کہ کہیں تبدیلی آ کر سب کچھ جلا کر بھسم نہ کر دے اور ان کا معیار زندگی گر نہ جائے، ان کو اس پورے نظام کو برقرار رکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس طرح مشرق میں فلاحی جمہوری اور مضبوط مملکتوں کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے پاتا۔

مغرب کے اس دوہرے معیار کی ایک تیسری وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ مغرب کے خیال خام میں صرف اسی معاشرے کے اصول ازلی اور ابدی ہیں اور جو معاشرہ ان کے تصور زندگی پر نہیں چلتا، وہ لازماً وحشی اور گنوار ہے۔ مغرب اپنے احساس برتری میں سمجھتا ہے کہ اس کا لباس، اس کی خوراک، اس کا میوزک، اس کا اخلاق اور اس کا پورا طرز زندگی بلا کم و کاست اپنایا جائے اور جو معاشرہ ایسا نہیں کرتا، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ البتہ ایسے معاشروں سے وہ تعرض نہیں کرتا، جو اس کے عالمی مفادات پورے کر رہے ہوں اور جن کے چھیڑنے سے اس کے کچھ اور مقاصد کو

نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ اگر مغربی فکر کے بنیادی پتھر، یعنی جمہوریت ہی کے ذریعے سے ایسی ریاست بننے کا اندیشہ ہو، جو مغربی طرز زندگی کے لیے خطرہ ہو، تو ہر ممکن حربے سے کام لے کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ مغرب کے خیال میں ہر وہ راستہ جو اس کا راستہ نہیں ہے، مغرب کے اسی نوے کروڑ لوگوں کے لیے خطرے کا سگنل ہے، لہٰذا باقی ساڑھے چار ارب انسانوں کے لیے وہی راستہ ٹھیک ہے، جس کے ذریعے سے اسی کروڑ افراد کا طرز زندگی محفوظ رہے۔ چنانچہ ایران، الجزائر، انتفاضہ اور خلیج کا قصہ اس وقت تک بار بار دھرایا جاتا رہے گا، جب تک مغربی طرز زندگی کو جمہوریت، امن، فلاح، اور اخلاقی برتری کے اعتبار سے ایک نئی تہذیب چیلنج نہ کرے۔ (اکیسویں صدی اور پاکستان ۸۶-۹۰)

---

حقیقت یہ ہے کہ اگر قیادت مخلص ہو اور ٹیم باکردار، تو ان مقاصد کو حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ دراصل یہ قانون نہیں ہوتا، جو معاشرے کو صحیح سمت پر گامزن رکھتا ہے، بلکہ قانون پر عمل کروانے والے افراد ہوتے ہیں، جو سسٹم کی کامیابی یا ناکامی کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ قانون کے محافظ نہ تو کسی جرم کے نفاذ کو روک سکتے ہیں، نہ ہی کسی کو رعایت دے سکتے ہیں، اس لیے کہ ہر لفظ کے ساتھ فرار اختیار کرنے کا ایک راستہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ تمام قانونی سقم دور کرنے چاہییں، لیکن اصل ضرورت پورے سسٹم کی تبدیلی اور ایک عظیم اخلاقی انقلاب کی ہے۔ جب بھی پوری قوم اور خصوصاً اونچے طبقے میں یہ اخلاقی انقلاب برپا ہو گیا، ہماری ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔

(اکیسویں صدی اور پاکستان ۳۵۸)

اشاریہ

عقیل احمد انجم

# اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۱۰ء



## قرآنیات



## معارف نبوی

## دین و دانش



## شذرات

## نقطۂ نظر



## سیر و سوانح



## یسئلون

## وفیات



## نقد و نظر





## اصلاح و دعوت



## تبصرۂ کتب



## ڈاکٹر محمد فاروق خان کی شہادت

(خصوصی اشاعت)

## اشاریہ